اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

مارچ ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
یکساں قومی نصاب ۔ خدشات و مضمرات	۲۵۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	۵۰
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	۵۰
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	۵۰
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرِ طبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت ۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظامِ تعلیم	۴۵۰
نصابِ مدنیؒ	۸۰
مدرسہ ڈسکورسز ۔ مطالعہ و تجزیہ	۲۵۰
اصلاحِ دینی مدارس	۴۰۰

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۳۰۰

	قیمت
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	۴۰
خاموش انقلاب ۔ ضرورت و اہمیت	۳۵۰
عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۵۰

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۵۰۰
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۸۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
اسلام اور تعمیر سیرت (زیرِ طبع)	

مغربی فکر و تہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۳۵۰
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
اسلام اور ردِ مغرب	۳۰۰

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۱۰۰۰
مقالاتِ امین (جلد دوم)	۱۰۰۰
شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

---

مندرجہ ذیل کتابوں کے کچھ نسخے ادارے میں دستیاب ہیں۔
خریدنے کے خواہش مند حضرات رابطہ فرمائیں:

ترکِ رذائل احمد جاوید (مرتب: ڈاکٹر محمد امین)

صفحات: ۲۹۲ قیمت: ۳۵۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً) ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۶۲ قیمت: ۸۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

تعلیمی ادارے اور کردار سازی ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۱۷۲ قیمت: ۲۰۰ روپے (بغیر ڈاک خرچ)

مکتبہ البرہان

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@outlook.com

ماہنامہ

البرہان لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۳، مارچ ۲۰۲۱ء / رجب ۱۴۴۲ھ

مدیر: ڈاکٹر محمد امین
نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت
اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے
سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے
تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
A/c # 02011478219

برائے رابطہ
97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700
ادارتی امور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

مشمولات

○فکر و نظر

معیشت۔ ہمارے بزدل حکمران ۴

○تعلیم و تربیت

۔ علم کیا ہے؟ احمد جاوید ۵
۔ پاکستان میں انگریزی کا تسلط محض بے عقلی ہے ایاز امیر ۷
۔ مسالک سے بالاتر اور اصلاح پسند نئے وفاق کی ضرورت مدیر ۱۰
۔اوقاف آرڈیننس میں تبدیلی ڈاکٹر راغب حسین نعیمی ۱۶

○تزکیۂ نفس

اللہ اپنے بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟ اشفاق احمد ۲۲

○دینی تحریکیں

ایک ہمہ جہت نئی دینی اصلاحی تحریک کی ضرورت (۲) مدیر ۲۴

○تفہیم اسلام

جدید ٹیکنالوجی۔ قرآن کے لیے چیلنج نہیں ڈاکٹر محمد امین ۴۱

○تفہیم مغرب

ٹیکنو سائنس.....ایک تجزیہ سید ذیشان ارشد ۴۶

○مطالعۂ کتاب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب سے مکالمہ مدیر ۵۰
اصلاح اور اقامتِ دین متغایر تصورات نہیں

○تبصرۂ کتب

’قلم قتلے‘ از ڈاکٹر انوار احمد بگوی ملک شفقت حیات اعوان ۵۷

فکرونظر

معیشت۔ ہمارے بزدل حکمران

* ہم بحالیٔ ہوش وحواس اپنی سیاسی وعسکری قیادت پر بزدلی کا الزام لگا رہے ہیں۔ کیوں؟

* دیکھیے! اس وقت پاکستانی عوام کا ایک بنیادی مسئلہ معاشی بدحالی اور مہنگائی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے آئی ہوئی تحریک انصاف کی حکومت یہ مسئلہ حل کرنے میں ناکام ہوچکی ہے اور اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

* ’سٹیٹس کو‘ اس مسئلے کا حل تھا اور نہ ہے۔ اس کے لیے ’تبدیلی‘ کے نعرے کی نہیں ’حقیقی تبدیلی‘ کی ضرورت تھی اور ہے۔ جب آپ کے پاس سابقہ حکومتوں کے قرض چکانے کے لیے پیسے نہیں تھے تو آپ آئی ایم ایف کے پاس کیوں گئے؟ اس کا سیدھا حل یہ تھا کہ آپ ہاتھ کھڑے کردیتے کہ ہمارے پاس وسائل نہیں، ہمارے لوگ بھوکے مر رہے ہیں لہٰذا ہم اگلے دس سال تک قرض واپس نہیں کرسکتے۔ یہ ممکن تھا اور اب بھی ممکن ہے لیکن اس کے لیے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے اور ہماری سیاسی اور عسکری قیادت یہ ’اعصابی جنگ‘ لڑنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ کیوں نہیں رکھتی؟ اس لیے کہ اس نے آج تک امریکہ ویورپ کی غلامی سے نکلنے کا فیصلہ نہیں کیا۔

* اس کا دوسرا انقلابی حل یہ تھا اور ہے کہ آپ بلوچستان کے تیل اور گیس کے ذخائر استعمال کرتے۔ تحقیق کے مطابق بلوچستان میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ آپ انہیں کیوں نہیں نکالتے؟ گوادر کے پانیوں سے جو تیل نکلنے والا تھا اس کا معاملہ کیوں ٹھپ ہوگیا؟

* اللہ کے بندو! امریکہ ویورپ کی غلامی سے نکلو۔ پاکستانی معیشت کو اپنے پیروں پر کھڑا کرو۔ امت کو بھوک اور ننگ سے بچاؤ۔ یہ ہماری معاشی اور عسکری ضرورت بھی ہے اور نظریاتی ضرورت بھی۔

تعلیم و تربیت

احمد جاوید

علم کیا ہے؟

جناب احمد جاوید نے ٦ فروری ۲۰۲۱ء کو المورد میں ’علم کیا ہے؟‘ کے موضوع پر لیکچر دیا۔ ذیل میں اس کے اہم نکات جو عثمان فاروق صاحب نے مرتب کیے ہیں، دیئے جا رہے ہیں۔ اصل لیکچر سے استفادے کے لیے مندرجہ ذیل لنک استعمال کریں:

https//:youtu.be/Ior6PvGpDYM

❁ لفظ مقابل ذہن ہوتا ہے۔ ایک ذہن personal ہوتا ہے اور ایک شعور کا محل لفظ ہے۔ لفظ میں معنی کا وجود، ذہن میں مفہوم کے وجود سے زیادہ مکمل اور زیادہ حقیقی ہوتا ہے۔ جتنا جتنا لفظ اور ذہن کے ساتھ مناسبت کا عمل پیدا ہوتا چلا جائے گا اتنا اتنا شعور اپنی مجموعی قوتوں کے ساتھ اپنے ہدف پر یکسوئی سے غور کرنے کے لائق ہوتا جائے گا۔

❁ ہمارے مروجہ نظام تعلیم کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں عقل اور حافظے کو کُل سمجھ لیا گیا ہے جس کے نتیجے میں علم یا تو یادداشت (معلومات کا مجموعہ) یا پھر قوتِ انکار بنا لیا گیا ہے جس کے ذریعے دوسرے کے واقعی علم کی نفی کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔

❁ ہماری روایت میں شعور صرف خیالات و تصورات کا خزانہ دار نہیں بلکہ احوال و احساسات بھی رکھتا ہے بلکہ انہیں generate کرتا ہے۔ شعور میں طبیعت اور ارادہ بھی شامل ہے اور یہ forms اور states دونوں کا مجموعہ ہے۔

❁ وجود نام ہے ذہن، طبیعت اور ارادے کا۔

❁ صورت کے علم میں غلطی حقیقت کے قرب کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جو صورت کے علم میں غلطی کو تخلیقی انداز سے وجود میں نہیں لاتا وہ حقیقت کے ساتھ وابستگی کے ذہنی تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

❁ روایت ہمارے ذہن کے حدود اور مقاصد دونوں کا تعین کرتی ہے۔ روایت ہماری

معلومات کو معلوم حقیقی سے مربوط رکھتی ہے۔ روایت ہماری ضرورت علم کو ہمارے تصور علم کے مستقل تابع رکھتی ہے۔

- اگر علم بیان کرتے ہوئے ہمارے اندر بڑھتا نہیں ہے تو جان لیں ہمیں علم سے مناسبت نہیں ہے۔
- علم ذہن کا وہ محتوی (content) ہے جو قابل ادراک ہونے کے ساتھ قابل اظہار بھی ہو۔
- چیزوں کے ردوقبول میں چار کسوٹیاں ملحوظ رکھنی چاہئیں:

حق و باطل، صحیح و غلط، مفید و مضر، رغبت و کراہت

مذکورہ بالا چار چیزوں میں سے چوتھی کسوٹی عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی ہے حالانکہ حقیقت اور صورت دونوں مقصودِ علم ہوں تو پھر رغبت و کراہت کی میزان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

- علم کے دو مدارج ہیں: صورت (form) کا علم اور حقیقت کا علم یعنی کثرت کا علم اور اس کی تقویم کرنے والے جوہر وحدت کا علم
- علم اور یقین کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل تعلق عقیدے اور یقین کا ہے۔
- علم کا آخری درجہ تصدیق مطلق بلا تصور ہوتا ہے جو ذہن سے باہر مکمل ہو کر ذہن میں آتا ہے۔ اس کی مثال belief structure ہے۔
- یقین کے لیے جس شے کا یقین ضروری ہے اس کے حضور میں علمی عاجزی و بے بسی ضروری ہے۔
- ہمارا ادراک اپنے اجمال اور ثبوت میں یقینی ہے لیکن استدلال، بیان اور اظہار میں ظنی ہو جاتا ہے۔
- یہ چیز ہمارے ارادے اور اختیار میں ہی نہیں ہے کہ ذہن کسی چیز کو تفصیل دیے، beautify کیے بغیر رہ سکے۔
- objectification کا مطلب ہے غیریت یا دوئی پیدا کرنا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۱)

تعلیم و تربیت **ایاز امیر**

پاکستان میں انگریزی کا تسلط اور اُردو کی حق تلفی محض بے عقلی ہے

یہاں سرکاری زبان والا عجیب مسئلہ ہے۔ انگریزی کو دفتری زبان بنا کہ ہم نے حاصل کیا کیا ہے؟ یا حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟ تمام سرکاری محکموں میں خط کتابت انگریزی میں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ہر ایک کی انگریزی زبان میں اتنی روانی نہیں ہوتی لیکن پھر بھی چونکہ دستور ہے تو انگریزی کے ساتھ کشتی کرنا پڑتی ہے۔ نتیجہ اکثر مضحکہ خیز نکلتا ہے لیکن ستر سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور ہم پھر بھی بحیثیت دفتری زبان انگریزی سے چمٹے ہوئے ہیں۔

عدالتی فیصلے انگریزی میں لکھے جاتے ہیں۔ کوئی پوچھے تو سہی کہ کس بنا پہ؟ چونکہ مسئلہ عدالتوں سے ہے تو احتیاط سے کام لینا لازم بن جاتا ہے لیکن اتنا کہنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ نچلی سطحوں پہ عدالتی فیصلے تحریر کراتے ہوئے اچھا خاصا زور لگانا پڑتا ہے۔ فیصلے اگر اردو میں لکھے جائیں تو جج صاحبان اور عوام دونوں کے لیے آسانی ہو۔ تمام وکلاء صاحبان اتنے بڑے انگریزی دان نہیں۔ اکثر بس گزارہ ہی کرتے ہیں۔ بحث ہو رہی ہو اور انگریزی کا واجبی سہارا لیا جا رہا ہو تو مؤکلین کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ گھر واپس آ کے وہ صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا وکیل بڑا بولا تھا، اور کہیں بھی کیا؟ کیونکہ جب انگریزی کے سطحی جملوں کا تبادلہ ہو رہا ہو تو بات مؤکلین کے سر سے اوپر ہی گزرتی ہے۔ مَیں تو یہاں تک کہوں گا کہ بڑی عدالتوں کے فیصلے بھی اردو میں ڈکٹیٹ کیے اور لکھے جائیں تو آسانیاں سب کے لیے ہوں گی۔ کم از کم ہمیں اتنا سوال تو کرنا چاہیے کہ عدالتی فیصلوں کے انگریزی میں ہونے سے قوم کی کون سی بہتری پیدا ہوئی ہے؟

کچھ اندازہ تو لگائیے کہ پولیس کانسٹیبل کو شوکاز نوٹس ملتا ہے تو انگریزی میں۔ تھانیداروں کی تحریری بازپرس ہو تو کارروائی انگریزی میں ہوتی ہے۔ ڈی پی او اور آر پی او صاحبان حکم صادر کرتے ہیں تو انگریزی میں۔ یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ شوکاز نوٹس کا جواب دینا ہو تو کانسٹیبلان اور تھانیدار صاحبان کو پیسے دے کے جواب لکھوانے پڑتے ہیں۔ یہ سارا انگریزی پہ انحصار سمجھ سے بالاتر ہے۔ زبان وہ ہونی چاہیے جو لوگ سمجھیں، جو عام آدمی سمجھے۔ انگریز دور کی

اپنی مجبوریاں تھیں۔ وہ دور گزر چکا ہے۔ روزمرہ کے کاموں کے لیے دفتری زبان اردو ہونی چاہیے۔ ایک تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے قوم کی جان بچ جائے اور دوسرا یہ کہ لوگوں کی سمجھ میں تو آئے کہ ان سے کہا کیا جا رہا ہے؟ یہاں تو حالت یہ ہے کہ موٹروے پہ بیشتر سائن انگریزی میں ہیں ’Better late than never‘ اور اس قسم کی دیگر ہدایات۔ پہلے اس امر کو تو یقینی بنالینا چاہیے کہ بسوں، ٹرکوں اور ویگنوں کے ڈرائیور حضرات انگریزی میں لکھی ہوئی ہدایات سمجھتے ہوں گے۔

سی ایس ایس کے امتحانات انگریزی میں ہوتے ہیں۔ کس وجہ سے؟ جو انگریزی کے ان جھمیلوں میں پڑتے ہیں کیا وہ زیادہ فرض شناس ہوجاتے ہیں؟ محنت و لگن ان میں زیادہ پیدا ہوجاتی ہے؟ نوکر شاہی کے حال سے ہم واقف ہیں۔ انگریزی میں سرکاری مراسلے لکھنے سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟

یا تو یہ دلیل دی جائے کہ انگریزی میں یہ ساری کارروائیاں کرنے سے ہم ترقی یافتہ ہوگئے ہیں اور ہم چین، جاپان، جنوبی کوریا اور ان جیسے ممالک سے ترقی کی دوڑ میں آگے نکل چکے ہیں کیونکہ ہم نیم خواندہ انگریزی کی دولت سے آراستہ ہیں، پھر تو کوئی بات بنے۔ ہمارا اعزاز ہے کہ ان سارے ممالک سے ہم پیچھے ہیں لیکن نیم خواندہ انگریزی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ پہلی جماعت کا طالب علم چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے، لیکن اس پہ ہم نیم خواندہ انگریزی کی ٹوپی پہنا دیتے ہیں۔ پڑھانے والے اساتذہ کو مشکل اور بچوں کو ایسی کنفیوژن میں ڈال دیا جاتا ہے جن سے ان کا سارا ذہنی ارتقاء ہمیشہ کے لئے متاثر ہوجاتا ہے۔ پہلی سے پانچویں جماعت تک تو ہر مضمون اپنی زبان یعنی اردو میں پڑھایا جانا چاہیے۔ چھٹی جماعت سے انگریزی کو بطور ایک مضمون شروع کیا جانا چاہیے۔ جرمنی، فرانس، سویڈن، ہالینڈ... ان سب ممالک میں یہی ہوتا ہے۔ ہر مضمون اپنی زبان میں اور ایک سٹیج پہ انگریزی بطور ایک مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ ہماری نہ اردو ٹھیک نہ انگریزی اور اوپر سے کبھی ایک ناصح آتا ہے کبھی دوسرا کہ عربی بھی پڑھانی چاہیے۔ ایسی صورت حال قومی کنفیوژن کی مظہر ہے لیکن فیصلہ سازوں کو اِس کی قطعاً کوئی پروا نہیں کیونکہ ہمارا نظام تعلیم طبقاتی ہے، اوپر سطح والوں کے لیے انگریزی تعلیم اور عوام الناس کے لیے ایک ایسی کھچڑی جس میں کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی، کچھ اردو اور حسب توفیق عربی۔ کوئی تو مائی کا لعل ہو جو اس کنفیوژن کو ختم کر سکے، لیکن اوپر کے طبقات کو یہ نظام سوٹ کرتا ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں انگریزی کا اولین مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں آگے نکلنے کے لیے ایک سیڑھی مہیا ہوجائے۔ ہمارے معاشرے میں اگر آپ انگریزی فر فر بول سکیں تو یوں سمجھیے کہ آپ بخشے گئے۔

یہ بالکل درست ہے کہ انگریزی کی اب ایک بین الاقوامی حیثیت ہے لیکن آپ چھٹی جماعت سے ہر طالب علم کو انگریزی بطور مضمون پڑھائیں تو انگریزی سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے۔ ہمارے کچھ سکولوں نے البتہ ایک عجیب تماشا لگایا ہوا ہے۔ کبھی ان سکولوں میں جائیں تو سہی، بچوں کو اِس قسم کی انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے صحیح طور پہ ان کی ذہنی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ کبھی کبھار مجھے چکوال کے ان پرائیویٹ سکولوں میں بطور مہمان بلایا جاتا ہے اور وہاں بچوں کی حالت دیکھ کے اور انہیں جس قسم کی نیم خواندہ انگریزی تعلیم دی جا رہی ہوتی ہے، وہ دیکھ کے میں شرما جاتا ہوں کہ ہم اپنے بچوں کے ساتھ کر کیا رہے ہیں؟ بیچارے ٹیچر اور میڈمز جن کی خود انگریزی اتنی اعلیٰ نہیں ہوتی، وہ انگریزی کی نرسری شاعری بچوں کو رٹوا رہے ہوتے ہیں۔ نہ انگریزی صحیح نہ اردو، نہ یہاں کے رہے نہ وہاں کے۔ یہ تماشا ہم نے اپنی قوم کے ساتھ لگایا ہوا ہے اور تہتر' چوہتر سال میں ایک حاکم ایسا نہیں آیا جس میں اتنی ہمت اور سوچ ہو کہ اس شرمناک صورتحال کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس موضوع پہ جس سے بات کریں چھٹ جواب ملتا ہے کہ تربیت کے لیے انگریزی ضروری ہے۔ انگریزی کی افادیت سے کون انکار کرتا ہے لیکن پورے معاشرے کو Baba Black Sheep والی تعلیم دینے سے کونسی اعلیٰ تربیت ہو جاتی ہے؟ یہ جو ہمارے انگریزی سکول ہیں خاص طور پہ جن کے بڑے نام ہیں انہوں نے کتنے آئن سٹائن یا سائنسدان پیدا کئے ہیں؟ یہ او لیول اور اے لیول کے امتحانات، یہ بھی ایک شرمناک داستان ہے۔ ہندوستان میں انگریزی کا معیار ہم سے اونچا ہے لیکن ہندوستان میں او اور اے لیول کے امتحانات 1964ء میں ختم کئے گئے تھے' ہم نے اِن کو گلے سے لگایا ہوا ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ امتحانات کر کے ہمارے اوپر والے طبقات کے بچوں کو امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ جیسے ملکوں میں جانے کی آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ یا تو وہاں جا کے سائنسدان بن رہے ہوں پھر بھی کوئی بات ہے لیکن ہمارے اکثر طالب علم دوسرے درجے کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لیتے ہیں، اس خواب کے ساتھ کہ اس کے بعد وہیں کہیں مقیم ہو جائیں گے۔ جس کسی سے بات کرو بڑے فخر سے کہتا ہے کہ میرا بیٹا یا بیٹی باہر فلاں یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں یا امریکہ اور کینیڈا میں سیٹل ہو چکے ہیں۔ افسران اور بڑے لوگوں کی ساری کمائی پاکستان میں، صحیح طریقوں سے یا ہیرا پھیری سے پیسے سارے یہاں بنائے ہوئے، لیکن تڑپ باہر مقیم ہونے کی۔ نیم خواندہ انگریزی سے جان چھڑانے کا وقت آ چکا ہے۔ اور کچھ نہیں تو دفتری زبان تو پلیز اردو کر دیجئے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

مسالک سے بالاتر اور اصلاح پسند نئے وفاق کی ضرورت

پانچ نئے مسلکی وفاق مسئلے کا حل نہیں

'اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ' حکومت کی جو مزاحمت کر رہی تھی وہ صحیح تھی اور اسے جاری رہنا چاہیے

حکومت نے حال ہی میں دینی مدارس کے پانچ نئے مسلکی وفاقوں کو منظوری دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مسئلے کا حل نہیں۔ اس سلسلے میں ہم حکومت اور پہلے پانچ وفاقوں کا مؤقف بھی بیان کریں گے لیکن اس سے پہلے ہم اپنی چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا مؤقف

اصلاحِ تعلیم کے پلیٹ فارم سے ہم جو غور فکر اور سعی و جہد پچھلے تیس سال سے کر رہے ہیں، اس کے مطابق دینی مدارس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انہیں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اصلاح کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں ان میں سے زیادہ اہم دو ہیں: ایک یہ کہ دینی مدارس کا نظام مسلک پر مبنی نہیں ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ تعلیمی ثنویت کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک مسلک پرستی اور تعلیمی ثنویت دونوں اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں اور ان کی وجہ سے دین اور امت کا بہت نقصان ہو رہا ہے۔

دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کے مسالک پر مبنی ہونے کی وجہ سے مسلک پرستی اور فرقہ واریت پھیلتی ہے، ہمارے سامنے پھیل رہی ہے اور اس نے امت اور پاکستان کی وحدت اور یکجہتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس سے مسجدیں الگ ہو گئیں، مدرسے الگ ہو گئے، دینی سیاسی جماعتیں الگ ہو گئیں، دینی اصلاحی جماعتیں الگ ہو گئیں، صوفیاء کے حلقے الگ ہو گئے اور امت میں افتراق و انتشار پھیل گیا۔ لوگ مسلک کو دین سمجھتے ہیں لہٰذا مسلک غالب آ رہے ہیں اور دین عنقا ہو رہا ہے۔

تعلیمی ثنویت کا مطلب ہے دینی و دنیاوی تعلیم کے نظام کا الگ الگ ہونا اور ان کا ایک

دوسرے سے مربوط نہ ہونا۔ ہمارے یہاں عصری اور دنیاوی تعلیم الگ ہے اور اس میں ضروری حد تک نہ اسلام کی تعلیم ہے نہ تربیت۔ ’’دینی تعلیم‘‘ جو مدارس میں دی جارہی ہے اس میں دنیاوی وعصری تعلیم تقریباً مفقود ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہ ’دین‘ کا کون سا تصور ہے جو دنیا کے علوم، ضرورتوں اور تقاضوں کا لحاظ نہیں کرتا۔ اصل اسلام میں تو دین و دنیا کی تفریق موجود ہی نہیں بلکہ دنیا کی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے ہی کا نام دین ہے۔ ہمارے اسلاف نے بارہ سو سال تک جو مدارس قائم کیے تھے ان میں بھی یہ تفریق نہ تھی؛ حتیٰ کہ ملا نظام الدین سہالویؒ نے ۱۷۲۱ء کے لگ بھگ جو ’درس نظامی‘ مدون کیا تھا، اس میں بھی یہ تفریق نہ تھی۔ اس میں دین و دنیا دونوں کے مضامین شامل تھے لہٰذا موجودہ ’درس نظامی‘ ناقص ہے اور اصلاح طلب ہے۔

۲۔ دینی مدارس کے نظام میں یہ جو دو بنیادی کمزوریاں ہیں، انہیں دور کرنے کی فکر نہ حکومت کو ہے نہ دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کو۔ لہٰذا ضرورت ایک ایسے وفاق کی ہے جو اصلاح پسند ہو اور ان دونوں خرابیوں سے پاک ہو۔ وہ اعلان کرے کہ اس کا تعلق کسی ایک مسلک سے نہیں بلکہ ہر مسلک کے مدارس اس کے رکن بن سکتے ہیں اور اس کا نظام و نصاب ایسا ہو کہ ہر طرح کے مسالک اس میں سما سکیں۔ یہ بالکل ممکن ہے اور ہم البرہان میں اس کی تفصیل دیتے رہے ہیں اور اگر کوئی اس پر عمل کرنا چاہے اور اسے اس میں مشکل پیش آئے تو ہم اسے ایسا تفصیلی نصاب و نظام بنا کر پیش کر دیں گے، ان شاء اللہ۔

اس مجوزہ وفاق کی دوسری خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ تعلیمی ثنویت کے خاتمے کا علم بردار ہو۔ اس میں دین و دنیا کی تفریق نہ ہو۔ بنیادی تعلیم دین و دنیا کی ایک ہو۔ تخصص اسلامی علوم کا الگ ہو سکتا ہے اور وہ ایسا تخصص ہو کہ دنیاوی اور جدید علوم کی تفہیم سے قاصر نہ ہو بلکہ اس کی اہلیت حکومتی ڈگری سے بھی زیادہ ہو تاکہ فارغ التحصیل علماء مساجد و مدارس کے علاوہ معاشرے اور ریاست میں بھی خدمات انجام دے سکیں اور انہیں اسلام کی برکات سے مالا مال کر سکیں۔ اگر مدارس نے ستر (۷۰) سال پہلے یہ کر لیا ہوتا تو آج بیوروکریسی، عدلیہ اور فوج وغیرہ میں ہر سو دینی مدارس کے لوگ ہوتے اور چھائے ہوئے ہوتے اور اسلام ہر جگہ غالب ہوتا لیکن افسوس کہ دینی مدارس اور دینی قوتوں نے یہ نہ سوچا۔ اللہ کے بندو! اب ہی یہ سوچ لو۔

حکومتی مؤقف

۱۔ ہماری حکومتیں بلکہ حکمران طبقے (یعنی سیاستدان، بیوروکریسی، فوج، عدلیہ وغیرہ) بدقسمتی سے ابھی تک مغرب کی غلامی کے مائنڈ سیٹ سے نکلنے کو تیار نہیں۔ انہوں نے آج تک پاکستان کو ایک خودمختار اور مستحکم اسلامی پاکستان بنانے کا نہیں سوچا۔ وہ مدارس کے حوالے سے امریکہ و یورپ کا دباؤ کیوں قبول کرتے ہیں؟ بلکہ وہ سیکورٹی کے حوالے سے امریکہ و یورپ کا دباؤ کیوں قبول کرتے ہیں؟ ہم پہلے دن سے کہہ رہے ہیں کہ افغانستان میں مغرب کی جنگ ہماری جنگ نہیں تھی اور اب تو تحریک انصاف کی حکومت بھی یہی کہہ رہی ہے۔ اس کے باوجود ہماری سیاسی اور عسکری قیادت دینی مدارس کے حوالے سے مغربی دباؤ قبول کر رہی ہے۔ آخر کیوں؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دینی مدارس میں اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اگر حکومت مغربی دباؤ میں آ کر نہیں، اخلاص اور خیر خواہی کے ساتھ مدارس میں اصلاحات کرنا چاہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے علماء کرام کو عزت و احترام دیجیے، ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح مل بیٹھ کر سوچیے۔ معتدل اور سنجیدہ علماء کرام کے سامنے مسائل رکھیے، ان سے گفت و شنید، بحث مباحثے اور تبادلہ خیال کے ساتھ اور دلیل سے، محبت سے ان سے چیزیں منوائیے۔ ہمیں یقین ہے وہ مان جائیں گے۔ ساری نہ سہی، تھوڑی تھوڑی کر کے بتدریج مان جائیں گے لیکن معاف کیجیے گا آج تک یہ طریقہ آزمایا ہی نہیں گیا۔

پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا۔ دینی حلقوں میں سے شاید ہی اب کوئی تحریک طالبان پاکستان کی حمایت کرتا ہو جبکہ اس کی امریکی و بھارتی حمایت سب پر واضح ہو چکی۔ لہٰذا مدارس کے ساتھ گفتگو کیجیے ان کو تعلیمی ادارے سمجھ کر۔ اگر مدارس کو سیاسی جماعتوں کے اثرات سے بچانا پیش نظر ہو تو یہ کام بھی مدارس کے ساتھ مشاورت کر کے سلیقے اور حکمت سے کیا جا سکتا ہے، انہیں حریف سمجھ کر نہیں۔

حکومت اگر چاہے تو بآسانی مدارس اور ان کے وفاقوں کو مسلکی گرفت سے نکال سکتی ہے بلکہ مساجد، مدارس، دینی سیاسی جماعتوں، دینی اصلاحی جماعتوں سب کو اس مصیبت اور معصیت

سے نکالا جا سکتا ہے اور نکالا جانا چاہیے اور حکومت اس میں مثبت کردار ادا کر سکتی ہے لیکن کیا حکومت اور اسٹیبلشمنٹ اس کے لیے تیار ہے؟ یا اپنی سابقہ پالیسی جاری رکھنا چاہتی ہے کہ علماء کو، مساجد و مدارس کو اور دینی قوتوں کو باہم لڑاتے رہو تا کہ مغرب اور مغربیت کے حامی حکمران طبقے راحت سے حکومت کرتے رہیں۔

جہاں تک مدارس کو تعلیم کے مرکزی دھارے میں لانے کا تعلق ہے تو یہ بھی ناممکن نہیں۔ آپ جدید تعلیم کا قبلہ سیدھا کیجیے اور اسے اسلامی اصولوں پر چلانے کا اعلان کیجیے۔ مدارس کے فہیم علماء کو بلا کر ان سے مشاورت کیجیے اور ان کے نظام میں اصلاحات کے لیے خود ان سے تجاویز مانگیے، کچھ تجاویز ان کے غور و فکر کے لیے پیش کیجیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اخلاص اور خیر خواہی پیش نظر ہو تو دینی مدارس کے فہیم عناصر آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اس وقت تک یہ طریقہ آزمایا ہی نہیں گیا۔ آپ انہیں ’غیر‘ اور ’مخالف‘ سمجھتے ہیں۔ اس طرح تو بات نہیں بنتی۔

دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کا مؤقف

جب حکومت مغربی دباؤ میں آ کر اختیارات اور قوت استعمال کرتی ہے اور مدارس کو ’غیر‘ اور ’مخالف‘ سمجھتی ہے تو مدارس بھی منطقی طور پر ’مدافعت‘ پر اتر آتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حکومتوں کا رویہ آج تک مدارس کے ساتھ غیر مناسب رہا ہے اور اس وقت بھی ہے۔ اسے بدلنا چاہیے۔ جب حکومت کا رویہ مفاہمت، تعاون، احترام اور محبت کا ہو گا تو مدارس اور ان کے وفاق بھی تعاون کریں گے۔ ہم ماضیٔ قریب میں ’اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ‘ پر زور دیتے رہے ہیں کہ وہ حکومت کے ناجائز مطالبات نہ مانیں اور قوت و یکجہتی کا مظاہرہ کریں اور ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے رجسٹریشن سے انکار کر کے ایک بہادری کا قدم اٹھایا ہے جس پر وہ تعریف اور حمایت کے مستحق ہیں۔ حکومت نے غلط کیا کہ ’اتحاد تنظیمات مدارس‘ سے مفاہمت کرنے کی بجائے نئے وفاق افراتفری میں منظور کر لیے اور یوں گویا پہلے وفاقوں کو بائی پاس اور غیر مؤثر کرنا چاہا جس کی ہم مذمت کرتے ہیں۔ تنظیمی لحاظ سے مزید وفاقوں کی ضرورت ہو سکتی ہے اور غالباً ہے لیکن اس کا طریقہ مسجد ضرار والا نہیں ہونا چاہیے۔

مدارس اور ان کے وفاقوں کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ مسلک پرستی اور تعلیمی ثنویت کی

دلدل سے کیسے نکلیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فہیم اور مدبر سینئر علماء مسلک پرستی اور تعلیمی ثنویت کی خرابیوں کو سمجھتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ مل کر حکمت سے کام کیا جائے تو وہ ان دونوں خرابیوں پر قابو پانے میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہم آج تک ''ایک وفاق'' کا نظریہ پیش کرتے رہے ہیں جس کے بہت سے دفاتر سارے پاکستان میں ہوں۔ اہل سنت (دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، جماعت اسلامی) کے مدارس آسانی سے ایک نصاب پر جمع ہو سکتے ہیں۔ کتابیں الگ الگ ہو سکتی ہیں جیسا کہ اس وقت جدید تعلیم میں ہوتا ہے۔ اہل تشیع کا سیکشن الگ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے امت، پاکستان اور مسالک میں یکجہتی اور اتحاد پیدا ہوگا اور فرقہ واریت اور مسلک پرستی میں کمی آئے گی۔ اس پر حکومت کو بھی غور کرنا چاہیے اور دینی مدارس کو بھی۔

ہم نئے بننے والے وفاقوں سے بھی درخواست کریں گے کہ تعلیمی حوالے سے پہلے وفاقوں کے تجربات سے سبق سیکھیں۔ اگرچہ اس وقت عمومی تاثر یہی ہے کہ نئے وفاق حکومت نے سوء نیت سے بنوائے ہیں لیکن اگر یہ نئے وفاق ٹھوس کام کریں، پہلے وفاقوں سے مل جائیں اور دینی مدارس کے جائز مطالبات حکومت سے منوائیں اور ایسی تعلیمی اصلاحات لائیں جو پہلے وفاق نہیں لا سکے تو وہ نظام میں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ خصوصاً مسلک پرستی سے ابا کرنا چاہیے اور تعلیمی ثنویت کے حوالے سے کام کرنا بھی ضروری ہے لیکن ساتھ ہی جدید تعلیم کی مغربیت سے بچنا بھی ضروری ہے جس کی حکومت علمبردار ہے۔

دینی مدارس میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟

یہ ایک طویل موضوع ہے اور اس پر مختصر لکھنا مخل فہم ہو سکتا ہے لیکن تکمیل بحث کی خاطر اس پر کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

سطور بالا میں ایک بات تو ہم نے یہ عرض کی کہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت سے بچا جائے۔ دوسری بات تعلیمی ثنویت کے خاتمے کے حوالے سے کی۔ دنیاوی وعصری علوم کی تدریس ناگزیر ہے لیکن اس کے لیے حکومتی نصاب مغرب زدہ اور غیر مناسب ہے۔ دینی مدارس کو اس کے

لیے اپنا نصاب اور نصابی کتب مدون کرنی چاہئیں اور قانون اس کی اجازت دیتا ہے لہٰذا دینی مدارس کو عصری ودنیاوی علوم کی کتابیں خود مرتب کرانی چاہئیں۔ ہم 'تحریک اصلاحِ تعلیم' کی طرف سے کئی دفعہ اعلان کر چکے ہیں کہ ہم ان کو اسلامی نصابی کتب بلا معاوضہ تیار کر کے دینے کو تیار ہیں لیکن وہ اس کے خواہش مند بھی تو ہوں۔

دینی مدارس جو دینی مواد اس وقت پڑھا رہے ہیں اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ اور دوسرے بہت سے اکابر یہ بات کہتے رہے ہیں۔ اس کی تلخیص یہ ہے:

''قرآن حکیم کو نصاب کا مرکز بنایا جائے۔ کتب حدیث کا تحقیقی مطالعہ بھی کرایا جائے۔ فقہ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور پاکستانی اور مغربی قوانین کا مطالعہ بھی اس میں شامل ہو۔ عربی زبان اس طرح پڑھائی جائے کہ لکھنے بولنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو۔ امت کی تاریخ وجغرافیہ، انگریزی زبان، مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ، اسلام بحیثیت نظام زندگی، جدید علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کی تفہیم بھی جزو نصاب ہونی چاہیے۔''

سارے مسالک کے علماء کرام نے آج سے بیس سال پہلے ہماری نصابی اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے اس پر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ ان میں مولانا حافظ فضل الرحیم، مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمیؒ، مولانا عبدالمالک، مولانا یٰسین ظفر اور دیگر علماء کرام شامل تھے۔ اس اصلاحی پیکیج کی تفصیل ہماری کتاب ''ہمارا دینی نظام تعلیم'' میں موجود ہے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ۱۹۳۳ء میں قدیم وجدید کا جو جامع اصلاحی نصاب تیار کیا تھا وہ ''نصاب مدنی'' کے نام سے مع توضیحات ہم نے شائع کر دیا ہے۔ اب ''اصلاح دینی مدارس'' کے نام سے ہماری تازہ ترین کتاب چھپ کر آ گئی ہے جس میں دینی مدارس کی اصلاح کے سارے پہلو زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ان کتابوں کی سافٹ اور ہارڈ کاپی ہمارے پاس موجود ہے اور عند الطلب مہیا کی جا سکتی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد راغب حسین نعیمی[1]

اوقاف آرڈیننس میں تبدیلی

مدارس و مساجد کے لیے حالات مخدوش بنائے جا رہے ہیں

اسلام میں وقف کی حیثیت مسلم ہے۔ اس کا لغوی معنی کھڑا کرنا، ٹھہرانا اور منع کرنا ہے۔ جبکہ اصطلاحاً کسی شے کو اپنی ملکیت سے نکال کر اللہ کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اس کے منافع کو کسی (فرد، افراد، معاشرہ، ادارہ) کے ساتھ خاص کرنے کو وقف کہتے ہیں۔ وقف کی بیع و ہبہ جائز نہیں ہوتی۔

جب کوئی شخص مسجد بنائے اور اس میں کسی نے آکر نماز ادا کر لی تو اب یہ جگہ وقف ہو جائے گی۔ آج کل مسجد بنانے سے قبل موقوفہ جگہ کو اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس بطور وقف رجسٹرڈ کروایا جاتا ہے، پھر اس پر مسجد تعمیر کی جاتی ہے۔ ایسے اگر کوئی مسافر خانہ، قبرستان، کنواں، ٹینکی بنا دے اور لوگوں کو اس کے استعمال کی اجازت دے دے تو شرعی طور پر یہ جگہیں وقف تصور کی جائیں گی۔ پاکستانی معاشرے میں عموماً مساجد، قبرستان، مسافر خانے اور پانی پلانے کی جگہیں وقف تصور کی جاتی ہیں۔ جبکہ قانونی طور پر اوقاف ایکٹ 1882ء کی دفعہ 5 کے مطابق کسی غیر منقولہ جائیداد کے سلسلہ میں کوئی وقف جائز نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا اعلان وقف کے بانی یا متولی کی جانب سے دستخط شدہ کسی غیر وصیتی دستاویز کے ذریعے یا وقف کے بانی یا اس کے متولی کی منظوری سے رجسٹرڈ شدہ نہ ہو۔ امام اعظم علیہ الرحمہ کا قول بھی یہی ہے کہ جب تک واقف کی ایما پر حاکم وقت وقف بننے کا حکم نہ کرے واقف کی ملکیت زائل نہیں ہوتی اور اسسٹنٹ رجسٹرار کے دفتر سے دستخط شدہ رجسٹری وقف درحقیقت اسی فقہی مطالبے کی عملی تصویر ہے۔

پنجاب میں وقف املاک کے بہتر نظم و نسق کے لیے "پنجاب وقف املاک آرڈیننس" 1979ء میں متعارف کروایا گیا۔ اس قانون میں بھی "وقف جائیداد" کی تعریف یہی کی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ جائیداد ہے جو کسی مسلمان نے مستقلاً وقف کر دی ہو اور کسی ایسے مقصد کے لیے

---

[1] ناظم اعلیٰ جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو لاہور

وقف کی ہو جو اسلام کی نظر میں مذہبی، مقدس یا خیراتی ہو۔ اس تعریف میں "مستقلاً وقف" اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ موقوفہ جگہ باقاعدہ بطور وقف رجسٹرڈ بھی ہو۔ ایسی جائیداد جو طویل عرصہ سے کسی ایسے مقصد (مذہبی، خیراتی) کے لیے استعمال ہو رہی ہو اس کے بطور وقف رجسٹرڈ نہ ہونے کے باوجود اسے وقف ہی تصور کیا جائے گا۔ جیسے بادشاہی مسجد، قبرستان میانی صاحب، دربار میاں میرؒ وغیرہ۔ اسی طرح ان مستقل یا قدیم اوقاف سے حاصل شدہ آمدنی بھی وقف متصور ہو گی۔ اسی قانون کی دفعہ 6 کے مطابق ہر وہ شخص جو کسی وقف جائیداد کا انچارج ہو یا اس کے نظم و نسق کا حامل ہو اور ہر وہ شخص جس نے آرڈیننس ہذا کے نفاذ کے بعد وقف قائم کیا ہو ایسی وقف جائیداد ایسے وقت میں اور اس اتھارٹی کے روبرو رجسٹری کرائے گا جسے اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔

یہ دفعہ واقف یا منتظم وقف کو پابند کرتی ہے کہ وہ اس قانون کے آنے کے بعد اپنی موقوفہ جائیداد کو باقاعدہ وقف جائیداد کی رجسٹری کروائے جو کہ اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس ہی ہوتی ہے۔ اب پنجاب وقف جائیداد ترمیمی ایکٹ 2020ء کے مطابق 1979ء کے آرڈیننس کی دفعہ 6 کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس ترمیم کے بعد جو وقف پہلے اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس رجسٹری کروایا جاتا تھا اب اسے "ناظم اعلیٰ اوقاف" کے پاس رجسٹر کروایا جائے گا۔ قانون کی عبارت دفعہ (1)6 یوں ہے: "ہر وہ شخص جو جائیداد وقف کرے یا ہر "مینجر" (منتظم جو موقوفہ جائیداد کا انتظام کر رہا ہے) اس وقف کو ناظم اعلیٰ اوقاف کے پاس مقررہ طریقہ کے مطابق قیام وقف کے بعد 90 ایام میں رجسٹر کروائے۔"

یہ دفعہ نئے وقف کے بارے میں تو واضح ہے لیکن گذشتہ قائم اوقاف کے بارے میں خاموش ہے۔ پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا 1882ء کے وقف ایکٹ کے مطابق اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس اب وقف جائیداد کو رجسٹر نہ کروایا جائے گا؟.......... جس کے بارے میں ابھی تک قانون خاموش ہے۔ کیا ناظم اعلیٰ اوقاف کا متعین عملہ اس وقف جائیداد کو رجسٹری کر کے دے گا یا صرف اس کا ریکارڈ مرتب کرے گا؟ اس طرح واقف کو پہلے ایک محکمہ سے رجوع کرنا پڑتا تھا اب اسے دو محکموں سے رجوع کرنا پڑے گا۔ پہلے وہ اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس وقف کی رجسٹری کروائے گا اور پھر ناظم اعلیٰ اوقاف کے پاس رجسٹرڈ کروائے گا۔ کیا اوقاف کا عملہ اس جگہ کی ملکیت وغیرہ کی تحقیق کر کے رجسٹرڈ کرے گا یا محض اوقاف کروانے والے شخص کے کہنے کو ہی

حقیقت سمجھے گا؟ یاد رہے حقیقت حال کے برعکس رجسٹرڈ کرنے سے لڑائی جھگڑے جنم لیں گے۔

ایک سے زائد جگہ رجسٹرڈ کروانے سے وقف کا کام طویل ہو جائے گا اور اللہ کے لیے وقف کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ اسی دفعہ کی ذیلی دفعہ 2 کے مطابق اگر کوئی واقف یا منتظم ناظم اعلیٰ اوقاف کو وقف جائیداد متعین مدت (جس کا ناظم اعلیٰ اوقاف نے 9 اکتوبر 2020ء سے آغاز کر دیا ہے جو کہ 90 دن ہے اور 9 جنوری 2021ء کو یہ مدت ختم ہو چکی ہے) میں رجسٹر نہ کروائے تو اسے اگلے 90 دن میں ہر گزرتے دن پر 50 ہزار روپے یومیہ جرمانہ اور 90 دن کے بعد ہر گزرتے دن پر ایک لاکھ روپے جرمانہ دینا ہوگا۔

ناظم اعلیٰ اوقاف نے ہر پرائیویٹ (ذاتی) وقف جو کہ حکومتی انتظام میں نہ ہے، کے منتظم کو بذریعہ حکم نمبر ایس او پی-5-(1) ڈی ڈی ای/ 2019ء مجریہ 9 اکتوبر 2020ء اسی کے وقف پر "Manager" متعین کر دیا ہے اور اس کی ذمہ داریاں بھی متعین کر دی ہیں کہ ایک منیجر وہ شخص ہے جسے ناظم اعلیٰ اوقاف ایک وقف جائیداد کے انتظام و بحالی کے لیے مقرر کرے۔ اسی طرح اب ہر غیر اوقافی وقف کا واقف یا منتظم اسی وقف کا "منیجر" بن گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پرائیویٹ حیثیت میں کسی مذہبی وقف کو چلانے والے کو اسی کے منتظمہ وقف پر حکومت "منیجر" مقرر کر سکتی ہے؟ جبکہ ابھی تک اس کا وقف محکمہ کے پاس رجسٹرڈ بھی نہ ہوا ہے۔

سر دست مساجد و خانقاہ کی سطح پر اسے بادل ناخواستہ قبول کر بھی لیا جائے لیکن مدرسہ کی سطح پر اس منتظم کو تیسرے محکمہ مدرسہ رجسٹریشن ڈائریکٹوریٹ کے پاس جا کر رجسٹرڈ کروانا ہوگا یعنی محکمہ مال کے پاس جگہ وقف رجسٹرڈ ہوگی۔ محکمہ اوقاف کے پاس مدرسہ بطور وقف رجسٹرڈ ہوگا اور محکمہ وفاقی تعلیم میں مدرسہ بطور تعلیمی ادارہ رجسٹرڈ ہوگا۔ تصور کیجیے کہ تبدیلی کے نام پر دین سے وابستہ افراد کے لیے کیا کیا مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں۔ اب اس ذاتی وقف کا سرکار کی طرف سے متعین کردہ وہی "منیجر" اپنی ہی موقوفہ جائیداد کا ریکارڈ مرتب کر کے رکھے گا، بوقت ضرورت ناظم اعلیٰ کو یہ ریکارڈ دے گا اور اسی وقف جائیداد میں کسی بھی قسم کی تبدیلی آنے پر متعین کردہ طریقے پر ناظم اعلیٰ اوقاف کو مطلع کرے گا۔ یعنی اب ہر معاملہ میں ذاتی حیثیت میں واقف اور منتظم ناظم اعلیٰ اوقاف یا اس کے نمائندے کو جواب دہ ہوگا۔ پہلے پولیس کے سپاہی یا کسی ایجنسی کے اہلکار کے آنے پر مدرسہ کا منتظم ہراساں ہو جاتا تھا اب اس کے لیے ایک نیا مسئلہ درپیش ہوگا کہ وہ محکمہ

اوقاف کے اہلکار کو بھی "راضی" کرے گا۔

1979ء کا اوقاف آرڈیننس دفعہ 8 کے تحت اظہار وجوہ کا نوٹس دیتا ہے جبکہ اب ترمیمی ایکٹ میں اس دفعہ کو ختم کر کے اظہار وجوہ کا نوٹس دیئے بغیر کسی ایسے شخص کو بذریعہ طاقت بے دخل کیا جا سکتا ہے جسے اس وقف جائیداد کے استعمال سے روکا گیا ہو یعنی اب کسی بھی قانونی سطح پر اسے عدالتی سہارا نہیں مل سکے گا۔ ترمیمی ایکٹ 2020ء کی دفعہ A2_20 کے مطابق کسی بھی غیر اوقافی وقف کا واقف یا منتظم حکام بالا کے احکامات کی روشنی میں درج ذیل معلومات دینے کا پابند ہوگا:

۱۔ وقف جائیداد سے فوائد حاصل کرنے والے افراد کی معلومات

۲۔ وقف جائیداد میں کام کرنے والے عملہ کے رہائشی پتے

۳۔ وقف جائیداد سے متعلقہ کسی فرد کی جائیداد یا کوئی اور ایسی معلومات جو اس وقف جائیداد کے متعلق ہو۔

1979ء کے وقف آرڈیننس کی دفعہ 24 کو تبدیل کر کے قرار دیا گیا کہ جو شخص ارادتاً دفعہ 20 کے حوالہ سے غلط معلومات دیتا ہے یا اس پر بوقت ضرورت تعمیل نہیں کرتا ہے اسے ایک سال سے پانچ سال تک قید کی سزا دی جا سکتی ہے اور اسے مالی غبن کی صورت میں غبن شدہ رقم کی تین گنا تک کے جرمانہ کی سزا مل سکتی ہے۔ ایسے ہی جو شخص دفعہ 6 کے حوالہ سے ارادتاً عدم تعمیل کرتا ہے یا معلومات چھپاتے ہوئے نامکمل معلومات دیتا ہے یا غلط معلومات دیتا ہے تو اسے بھی پانچ سال تک کی قید یا جرمانہ یا دونوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی دفعہ کی ذیلی دفعہ 5 کے مطابق اس آرڈیننس میں کوئی ایسا معاملہ، جس کا جرمانہ متعین نہ ہے، کرنے کی صورت میں 25 ملین (اڑھائی کروڑ) جرمانہ کی سزا ہو سکتی ہے۔

حاصل بحث

اس ترمیمی ایکٹ کے ذریعے حکومت کے مذہبی حوالہ سے "احسن اقدامات" کے بارے میں پتہ چل رہا ہے۔ یہ ترمیمی ایکٹ لانے کا مقصد اہل مساجد، خانقاہوں اور مدارس کو کنٹرول کرنے اور ان کے دفتری کاموں کو بڑھانے کے علاوہ کچھ نہیں نظر آتا کیونکہ مساجد کی رجسٹریشن تو اس سے قبل محکمہ صنعت کے زیر انتظام عرصہ دراز سے سوسائٹی ایکٹ 1860ء کے تحت ہو رہی ہے

اور ہر سال مساجد کی رجسٹریشن کی تجدید بھی ہوتی ہے۔ چند سال قبل تمام مساجد کی جیوٹیگنگ بھی ہو چکی ہے اور محکمہ پولیس کے پاس تمام مساجد کی معلومات پہلے سے موجود ہیں۔ مسجد اور خانقاہ و مزار کی بات الگ ہے لیکن اگر کوئی شخص ذاتی حیثیت میں مدرسہ بناتا ہے اور اس کی جائیداد وقف نہیں کرتا جسے "Charitable, Pious,Religious" کے تحت قرار دے کر "وقف" تصور کیا جا رہا ہے تو پھر کیا ہر ایسا ادارہ جو خیرات سے بنا ہے اور نیک مقاصد (تعلیم، طب، لوگوں کی امداد وغیرہ) سرانجام دیتا ہے، کو بھی محکمہ اوقاف میں رجسٹرڈ کروانا ہوگا؟ جواب یقیناً نفی میں آئے گا۔ نہیں تو اخوت یونیورسٹی، دی ٹرسٹ سکول، شوکت خانم ہسپتال وغیرہ کو بھی محکمہ اوقاف اپنے پاس رجسٹرڈ کرے کیونکہ یہ ادارے بھی مذہبی، خیراتی اور نیک مقصد پر مبنی ہیں۔

مدارس و مساجد کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے مؤقر اداروں اور افراد سے مشاورت نہ کر کے 1979ء کے آرڈیننس کی تبدیلی ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے۔ پنجاب چیریٹی کمیشن (جو NGO کے مالی معاملات پر نظر رکھنے کے لیے بنایا گیا) کے ایک سال گزرنے کے باوجود رجسٹریشن کروانے کے لیے ترغیبی اشتہارات ابھی تک شائع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مساجد، خانقاہوں اور وقف جائیداد کو محکمہ اوقاف میں رجسٹرڈ کروانے کے لیے بھی موثر حکمت عملی اپنائی جانی چاہیے تھی۔ اس کے لیے درج ذیل اقدامات کا اختیار کیا جانا یقینی طور پر فائدہ مند ہوگا:

۱۔ رجسٹریشن کروانے کے لیے موقر مذہبی اداروں، تنظیمات اور شخصیات کو اعتماد میں لیا جائے۔

۲۔ متولیان، واقفین اور منتظمین اوقاف کو باور کروایا جائے کہ اس قانون کے ذریعے صرف وقف اراضی کا ریکارڈ حاصل کر کے انہیں رجسٹرڈ کیا جائے گا اور محکمہ اوقاف ان ذاتی اوقاف/ مدارس وغیرہ کو اپنی تحویل میں نہیں لے گا جبکہ یہ ریکارڈ پہلے ہی محکمہ صنعت، پولیس اور سیکورٹی اداروں کے پاس موجود ہے۔

۳۔ پنجاب بھر میں موجود 52,000 سے زائد مساجد اور 25,000 سے زائد مدارس و دیگر اوقاف جائیداد کے لیے محکمہ اوقاف میں الگ سے ڈائریکٹوریٹ بنایا جائے اور اس کے مطابق عملہ کا تعین کیا جائے۔

۴۔ رجسٹریشن کروانے کے لیے ابتدائی مدت میں مزید اضافہ کیا جائے۔

۵۔ رجسٹریشن کروانے کے لیے باقاعدہ تشہیری مہم چلائی جائے۔

۶۔ محکمہ صنعت کے زیر انتظام مساجد کی رجسٹریشن کو ختم کر کے اسے محکمہ اوقاف کے زیر انتظام دے دیا جائے تاکہ محکمہ اوقاف میں وقف کی رجسٹریشن کے ساتھ ساتھ مسجد کی رجسٹریشن بھی ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو پھر مسجد کی رجسٹریشن کے لیے تین محکموں کے پاس جانا پڑے گا۔

۷۔ قانون میں ترمیم کر کے دیر سے رجسٹر کروانے والے منتظمین پر عائد جرمانہ کو مناسب حد تک کم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ معلومات کی عدم فراہمی پر رکھی گی سزا اور جرمانہ میں بھی مناسب حد تک کمی کی جائے۔

۸۔ اوقاف کے تیار شدہ رجسٹریشن فارم کی شق 7 میں صرف اتنا سوال ہے کہ وقف سنی ہے یا شیعہ؟ اس لیے مساجد و مدارس کے رجسٹریشن فارم میں مسلک کا خانہ بنایا جائے تاکہ بعد میں بین المسالک جھگڑے نہ ہوں۔

بقیہ: علم کیا ہے؟

- بیان و اظہار اپنی نوع میں ظن ہے اور ادراک مطلق یقین ہے۔
- اپنی حقیقت سے detachment اور غایت سے صرف نظر کر کے علم پیدا نہیں ہو سکتا۔
- فطرت کہتے ہیں حقیقت اور غایت کے امتزاج (blend) کو۔
- ہمارے وجود کو چلانے والی تمام percievable قوتیں اپنی بناوٹ، مقاصد اور ماہیت میں اخلاقی ہوتی ہیں اور اخلاق نام ہے فطرت سے ہم آہنگ ذہن، ارادے اور طبیعت کا۔
- ہر علم کے لیے لازم ہے کہ وہ اخلاقی نتائج پیدا کرے کیونکہ علم نام ہے وجود سے ہم آہنگی کا۔ اور وجود کا پورا سسٹم اخلاقی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جدید تصورات نے آزادیٔ فکر کے نام سے علم کی اخلاقی تاثیر کو کند کر دیا ہے۔ علم کا مطلب ہے انسان کی اخلاقی تکمیل کرنے والی سب سے بڑی قوت۔ ہر علم مفید اخلاق یا مضرِ اخلاق ہوتا ہے۔ کلاسیکل فلسفے میں بھی فلسفہ، فلسفۂ اخلاق ہی تھا بقول سقراط فلسفے کا مقصد ہے اچھا آدمی کیسے بنا جائے۔

تزکیۂ نفس

اشفاق احمد

اللہ اپنے بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟

مجھے اس سوال کا ایسا جواب ملا کہ آج تک مطمئن ہوں!

ہمارے ویٹرنری (Veterinary) ڈپارٹمنٹ کے ایک پروفیسر صاحب ہوا کرتے تھے، میرے اُن سے اچھے مراسم تھے. ایک دفعہ میں ان سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگے ایک مزے کا قصّہ سناؤں تمہیں؟ میں نے کہا: جی سر ضرور!

انھوں نے کہا کہ: پچھلے ہفتے کی بات ہے مَیں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اچانک مجھے پیغام ملا کہ امریکہ کی سفیر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اُن کے کتے کو کچھ پرابلم ہے اس کا علاج کر دیجیے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ خاتون سفیر اپنے اعلیٰ نسل کے کتے اور اپنے دفتری عملے کے ساتھ آن پہنچیں۔ بیماری پوچھنے پر کہنے لگیں کہ میرے کتے کے ساتھ عجیب وغریب مسئلہ ہے۔ وہ میرا نافرمان ہوگیا ہے۔ اسے میں پاس بلاتی ہوں یہ دور بھاگ جاتا ہے۔ خدارا کچھ کریں یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس کی بے اعتنائی مجھ سے سہی نہیں جاتی۔

میں نے کتے کو غور سے دیکھا۔ دس منٹ جائزہ لینے کے بعد مَیں نے کہا: میم! یہ کتا ایک رات کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں مَیں اس کا معائنہ کر کے حل ڈھونڈتا ہوں.... سفیر محترمہ نے بڑی بے دلی سے اسے چھوڑ جانے پر حامی بھر لی۔

سب چلے گئے تو میں نے کمدار کو آواز لگائی۔ اور اس سے کہا: فیضو! اس کتے کو بھینسوں کے باڑے میں باندھ دو اور ہر آدھے گھنٹے بعد چمڑے کے چار پانچ لِتّر مارنا۔ اس کے بعد صرف پانی ڈالنا، جب پانی پی لے تو پھر لتر مارنا۔ کمدار جَٹ آدمی تھا۔ ساری رات کتے کے ساتھ لتر ٹریٹمنٹ کرتا رہا۔

صبح کو وہ خاتون سفیر پورا عملہ لیے میرے آفس میں آدھمکیں۔ میں نے کمدار سے کتا لانے

کو کہا، وہ کتا لے آیا۔ جوں ہی کتا کمرے میں داخل ہوا وہ چھلانگ لگا کے سفیر کی گود میں جا بیٹھا اور لگا دم ہلانے اور ان کا منہ چاٹنے! ساتھ ہی کتا مُڑ مڑ کر تشکر آمیز نگاہوں سے مجھے بھی تکتا رہا کیونکہ میں نے ہی کمدار سے اس کی رسّی چھڑائی تھی۔ سفیر پوچھنے لگی: سر آپ نے اس کا کیا علاج کیا کہ اچانک ہی یہ ٹھیک ہو گیا؟ مَیں نے جواب دیا: ریشم واطلس، ایئر کنڈیشنڈ روم اور اعلیٰ خوراک کھا کھا کے یہ خود کو مالک سمجھ بیٹھا تھا اور اپنے مالک کی پہچان بھول گیا تھا، بس اس کا یہ خناس اُتارنے کے لیے اس کو کچھ سائیکولوجیکل اور فیزیکل ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی وہ دے دی... ناؤ ہی از او کے!

اور مجھے سمجھ آ گئی کہ اللہ بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت: سالانہ 500 روپے پانچ سال: 2000 روپے تا حیات: 10,000 روپے

نام .... پتہ ....

فون ....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

دینی تحریکیں

ڈاکٹر محمد امین

ایک ہمہ جہت نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت (۲)

برائے انفرادی واجتماعی اصلاح

مجوزہ تحریک کا لائحہ عمل

مجوزہ اصلاحی تحریک کا منہجِ اصلاح

ان چند اصولی باتوں کے بعد اب آیئے مجوزہ اصلاحی تحریک کے منہج اصلاح کی طرف۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا یہ منہج دو اجزاء پر مشتمل ہے:

۱۔ موجودہ دینی قوتوں کی اصلاح

۲۔ فرد، معاشرے اور ریاست کی اصلاح کے لیے نئے سرے سے، نئے لائحہ عمل سے جدوجہد

موجودہ دینی قوتوں کی اصلاح

۱۔ بدقسمتی سے پاکستان کی حکومتوں، حکومتی اداروں اور حکمران طبقوں کو مسلمانوں کی اصلاح سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ الٹا مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کے زیر اثر وہ بگاڑ کا سبب، محرک اور مرکز بن چکے ہیں اور ان کی طرف سے دینی احکام پر عمل اور نفاذ شریعت کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

۲۔ اندریں حالات اصلاح کی ساری امیدیں دینی قوتوں سے وابستہ ہیں لیکن دینی قوتیں دو وجوہ سے اس اصلاحی کام کو متوازن اور مؤثر انداز میں نہیں کر پا رہیں:

ایک: یہ کہ انہوں نے زوال مسلم سے سبق نہیں سیکھا اور وہ اپنے آپ کو ان خرابیوں سے نہیں بچا سکیں جو زوال مسلم کا سبب بنیں یا جن کا ترک زوال کے گڑھے سے نکلنے کے لیے ضروری ہے۔

دوسرے: وہ یا تو مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے، جو اس عہد کی غالب فکر وتہذیب ہے، مرعوب ہو گئی ہیں اور یا اس کے ردِّ عمل کا شکار ہو کر غیر متوازن ہو گئی ہیں۔

۳۔ ہم نے اپنی کتاب 'پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟' میں ان دونوں نکات کی تفصیل لکھ دی ہے۔ لیکن ہمارے دینی عناصر کے ہاں جس طرح کا ماحول ہے اس سے یہی توقع ہے کہ وہ ہمارے تجزیہ وتنقید کو قبول کرنے کی بجائے اپنے مؤقف کا دفاع کریں گے اور اپنے مؤقف پر نظر ثانی کرنے یا اس میں کسی تبدیلی لانے پر غور نہیں کریں گے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ ہماری مخالفت اور مذمت پر کمر بستہ ہو جائیں اور اسے ثواب دارین کا ذریعہ سمجھیں۔

ویسے بھی ہمارے علماء کرام کی نفسیات ایسی ہے کہ جسے وہ ''عالم'' نہ سمجھیں، وہ اس کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس لیے ہم مجوزہ اصلاحی تحریک کے وابستگان سے عرض کریں گے کہ کوئی صاحب جو دین کے باقاعدہ عالم نہ ہوں اور علماء ومدارس ومساجد کے حالات سے بہت تفصیل سے واقف نہ ہوں، وہ علماء کرام کی اصلاح کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان کا خدشہ زیادہ ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ پہلے ہماری مذکورہ کتاب کا مطالعہ کر لیں تاکہ وہ حالات کو ان کے صحیح تناظر میں سمجھ سکیں اور پھر کبھی اس موضوع پر لکھنا ہو یا گفتگو کی ضرورت آپڑے تو وہ صحیح تناظر میں بات کر سکیں اور اصلاحی تحریک کی بدنامی اور اس کے نقصان کا سبب نہ بنیں۔

اصلاح کا نیا منہاج

مجوزہ اصلاحی تحریک کے منہج پر غور کرنے والوں کے لیے مذکورہ دو نکات کا لحاظ رکھتے ہوئے (ایک یہ کہ زوالِ مسلم سے سبق سیکھنا ہے اور دوسرے یہ کہ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب نہیں ہونا اور نہ اس کے ردِ عمل کا شکار ہونا ہے) فرد، معاشرے اور ریاست کی اصلاح کے لیے بعض تجاویز ذیل میں دی جا رہی ہیں۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ ان کی حیثیت تجاویز ہی کی ہے اور باہم مشاورت سے ان پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے۔ نیز انفرادی اور اجتماعی زندگی چونکہ باہم متشابک ہوتی ہیں لہٰذا ان کی اصلاح کے لیے دی گئی یہ تجاویز ممکن ہے Overlap کرتی نظر آئیں۔

اصلاحِ فرد

یہاں ہم ان ذرائع اور عوامل کا ذکر کریں گے جو فرد کی ذہن سازی اور اس کی تشکیل سیرت پر اثر انداز ہوتے ہیں یعنی گھر، تعلیم، تزکیہ، میڈیا وغیرہ۔ اور مجوزہ اصلاحی تحریک کے علمبرداروں کو

قرآن وسنت کے تقاضوں کے مطابق فرد کی صحیح رُخ میں ذہن سازی اور تعمیر سیرت کے لیے انہیں استعمال کرنا چاہیے۔

گھر (والدین اور خاندان)

بچے کی شخصیت پر جو ہستی سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے وہ اس کی ماں ہے جو اسے پالتی ہے اور جس کا بچے کے ساتھ چوبیس گھنٹے کا واسطہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بچے کے والد اور اس کے بہن بھائی ہیں جن کے ساتھ وہ بچپن گزارتا ہے۔ یہ عرصہ وہ ہے جس میں بچے کی عادتیں بنتی اور رویے تشکیل پاتے ہیں۔ اسلام اسی لیے چاہتا ہے کہ بچے کی والدہ گھر میں رہے اور اس کی پرورش اور تعلیم وتربیت کرے۔ اگر ماں گھر پہ رہنے کی بجائے ملازمت پر چلی جائے گی تو پھر بچے کی پرورش اور تربیت کون کرے گا؟ ظاہر ہے کسی دوسرے فرد کو خصوصاً کسی ملازم یا ملازمہ کو بچے سے وہ محبت اور ہمدردی نہیں ہوسکتی جو ماں کو ہوتی ہے۔ مسلمان معاشرے میں بچہ عموماً چھ سال کی عمر میں سکول بھیجا جاتا تھا اور ماں باپ کی یہ چھ سالہ تعلیم وتربیت بچے کی مستقبل کی زندگی پر گہرے، دیرپا اور مثبت نقوش ثبت کرتی تھی۔

مغربی تہذیب میں چونکہ ماں ملازم پیشہ ہوتی ہے (اور نانی دادی بھی گھر میں میسر نہیں ہوتیں) اس لیے بچہ ڈے کیئر سنٹر میں پلتا ہے اور جب ذرا بڑا ہوجاتا ہے تو اسے سکول میں پلے گروپ میں ڈال دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ نرسری اور پریپ وغیرہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد پہلی جماعت سے باقاعدہ سکولنگ کے قابل ہوجاتا ہے۔ مغرب کی تو مجبوری یہ ہے کہ وہاں ماں گھر پہ نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاشرے میں تو مائیں گھر پر ہوتی ہیں لہٰذا مسلم معاشرے میں پری سکول کا تصور نہیں ہونا چاہیے لیکن برا ہو مغربی تہذیب کی نقالی کے رجحان کا کہ ہمارے ہاں بھی اب پری سکول تقریباً لازمی ہوکر رہ گیا ہے اور برا ہو ہمارے کتب فروشوں اور تعلیم فروشوں کا جنہوں نے بغیر ضرورت کے، محض پیسے بٹورنے کے لیے اس عمر کے بچوں پر اتنا بھاری بستہ لا دیا ہے کہ وہ اسے اٹھا بھی نہیں سکتے۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ والدین خصوصاً ماؤں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ اپنے بچوں کی اسلامی اصول واقدار کے مطابق تربیت کو اہمیت دیں اور اسے اپنی زندگی کا سب

سے اہم اور ضروری کام سمجھیں۔ اس پر پوری توجہ دیں اور اس پر محنت کریں کیونکہ ان کی اس توجہ سے ہی یہ بچے کل آخرت میں کامیاب ہوں گے اور دنیا میں بھی دین پر عمل کرنے والے، ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے خدمت گزار بنیں گے۔ پس اس صحیح تربیت میں والدین اور اولاد دونوں کا اخروی فائدہ بھی ہے اور دنیاوی بھی۔

تعلیم

تعلیم و تزکیہ اور دعوت و میڈیا کی اصلاح کی اہمیت سب سے بنیادی اور اہم تر ہے کیونکہ:

- یہ تعمیر سیرت/ کردار سازی/ تعمیر شخصیت/ ذہن سازی میں سب سے زیادہ کردار ادا کرتے ہیں۔

- یہ انسان کو اس کی زندگی کے بنیادی نصب العین کے مطابق عمل کے اہل بناتے ہیں جس کا بحیثیت انسان اور فرد وہ اپنی ذاتی حیثیت میں مکلف ہے یعنی دنیا میں عبودیت (عبادت واطاعت) کا رویہ اختیار کرنا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی نعمتوں کا مستحق بننا۔

- معاشرے اور ریاست کے اسلامی کردار کا انحصار بھی انہی افراد کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے کیونکہ معاشرہ بھی افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور معاشرے اور ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں۔

تعلیم کی اصلاح کے چند بنیادی اصول یہ ہیں:

- اسلام میں نظامِ تعلیم ایک اور موحد (Integrated) ہوتا ہے اور اس میں ثنویت اور دوئی (Dichotomy) نہیں ہوتی کہ دینی تعلیم الگ اور دنیاوی تعلیم الگ ہو۔

- اس وقت پاکستان میں جدید تعلیم اور دینی مدارس کا نظام تعلیم دونوں جزوی اور ناقص ہیں۔ دونوں مقاصد شریعت کو پورا نہیں کرتے اور دونوں اصلاح طلب ہیں۔ اصلاح کی نیت اور ارادہ کے بغیر ان کو چلانا دینی لحاظ سے صحیح اور مفید نہیں کیونکہ جدید تعلیم مغرب زدہ اور دینی مواد اور تربیت سے عاری ہے اور دینی مدارس کی تعلیم مغربی فکر و تہذیب کے ردِّ عمل کا شکار ہے اور دونوں زوال امت سے سبق نہ سیکھنے کے منہج پر استوار ہیں۔

- جب ہم نظام تعلیم کی اصلاح کی بات کرتے ہیں تو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نظام تعلیم کے پانچ اجزاء ہوتے ہیں اور جب تک ان سب کی اصلاح نہ ہو، مؤثر نتائج نہیں نکل سکتے:

۱۔ تعلیمی انتظامیہ ۲۔ استاد ۳۔ کتاب ۴۔ طالب علم ۵۔ درس گاہ کا ماحول

چونکہ جدید تعلیم اور دینی مدارس کی تعلیم کے اسالیب اور مسائل الگ الگ ہیں لہٰذا ان دونوں کی اصلاح کا لائحہ عمل بھی الگ الگ ذکر کرنا مفید ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ اصلاحی تحریک سے وابستہ لوگ جب جدید تعلیم کے اداروں یا دینی مدارس کی اصلاح کی بات کریں تو ان کے سامنے ایک واضح لائحہ عمل ہو۔

جدید تعلیم

- اسلام میں تعلیم کاروبار نہیں ہے لہٰذا جو شخص جدید تعلیم کی اصلاح کے لیے کام کرنے اٹھے یا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہے اسے اپنی نیت ابتدا ہی سے درست کر لینی چاہیے کہ وہ یہ کام دعوت و اصلاح کے لیے کرے گا اور عملاً وہ ایسا ہی کرے۔ اگر وہ فل ٹائم یہی کام کرے تو چونکہ ریاست اور معاشرہ اس کام میں اس کا ساتھ نہیں دیتے لہٰذا مجبوراً وہ طلبہ کے والدین سے اتنا معاوضہ (فیس) لے سکتا ہے جس سے اس کے ذاتی اخراجات پورے ہو جائیں اور ادارہ چلتا اور ترقی کرتا رہے۔

- جدید تعلیمی ادارہ کس طرح اسلامی مقاصد کے لیے کام کرے، اس پر ہم نے 'تحریک اصلاحِ تعلیم' کے پلیٹ فارم سے عمر بھر سوچا اور لکھا ہے اور اس کے لیے ہماری مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے:

- 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'
- 'تعلیم اور اس کا اسلامی کردار'
- 'ایک اسلامی سکول کے خدوخال'
- 'ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت'

'تعلیمی ثنویت کیسے ختم کی جائے؟' 'نیا ماڈل تعلیمی ادارہ کیسا ہوگا؟' 'اسلامی سکول کے

تقاضے کیا ہیں؟ اسلامی یونیورسٹی کی شکل کیا ہو؟ ملک کا نظام تعلیم اسلامی بنانا ہو تو کیا کرنا ہوگا؟ ان سب سوالوں کے واضح جوابات ہماری مذکورہ کتابوں میں دیے گئے ہیں۔

- جدید تعلیمی اداروں میں طلبہ وطالبات کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ اس انتہائی اہم موضوع پر ہماری دو کتابیں موجود ہیں:

  - تعلیمی ادارے اور کردار سازی
  - تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ

- اگر آپ جدید تعلیم کا کوئی ادارہ چلا رہے ہیں اور اسے اسلامی اصولوں پر ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بھی مذکورہ بالا لٹریچر مفید رہے گا۔ نیز تعلیمی اصلاح کے کسی بھی کام میں مشاورت کے لیے ہماری خدمات بلا معاوضہ حاضر ہیں۔

- خلاصہ یہ کہ والدین کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو اپنی استطاعت کے مطابق کسی مہنگے سکول میں بھیج کر مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں کہ بس انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا بلکہ انہیں دیکھنا چاہیے کہ جس سکول میں وہ اپنے بچے کو بھیج رہے ہیں کیا وہ ان کی اسلامی تربیت کرے گا؟ کیا وہ اسے مستقبل میں اچھا مسلمان بنائے گا؟ کیا وہ اسے اسلامی اصول واقدار سے آگاہ کرے گا؟ اگر سکول یہ کام نہیں کرتا یا اس کے برعکس اسے غیر اسلام کا اور مغرب کی کافرانہ فکر وتہذیب کا پیروکار بناتا ہے تو یہ چیز والدین کا اطمینان غارت کرنے کے لیے کافی ہونی چاہیے۔

لہٰذا والدین کو ایک ایسا سکول ڈھونڈنا چاہیے جو ان کے بچے کی تربیت اس طرح کرے کہ وہ آخرت میں بھی کامیاب ہو اور اس کی صلاحیتوں کو اس طرح صیقل کرے کہ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہو اور اسلامی اصول واقدار کے مطابق زندگی گزارے۔ اگر ایسا سکول والدین کو نہ ملے تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ہم خیال افراد کو ساتھ ملا کر ایسا سکول خود قائم کریں۔ نیز یہ کہ اگر سکول یہ کام نہیں کر رہا تو وہ اسے توجہ دلائیں بلکہ اس پر دباؤ ڈالیں کہ وہ یہ کام کرے۔ نیز اس کمی کو والدین خود اپنی اضافی محنت سے پورا کریں ورنہ ان کا بچہ، خدانخواستہ، دنیا وآخرت دونوں میں ناکام ہو جائے گا جس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

نیز جو لوگ نیا سکول، کالج یا یونیورسٹی قائم کرنا اور چلانا چاہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ ہماری ان گزارشات کو سامنے رکھیں یا جو لوگ جدید تعلیم کے ادارے چلا رہے ہیں اگر ہماری یہ سطور ان کی نظر سے گزریں اور انہیں ہماری بات سے اتفاق ہو تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے موجودہ تعلیمی ادارے کا رنگ ڈھنگ بدلیں اور اس میں مذکورہ تبدیلیاں لائیں۔ جب وہ ایسا کرنا چاہیں گے تو ہمارا تیار کردہ لٹریچر ان کی رہنمائی کرے گا اور ہم خود بھی مشاورت و اعانت کے لیے حاضر ہیں۔

دینی مدارس کی تعلیم

* دینی مدارس چلانے والے علماء کرام اگر بیدار مغز ہوں اور سچ مچ عالم ہوں تو انہیں دو باتوں کا پتا ہونا چاہیے۔

ایک: یہ کہ ہمارے ہاں مروج 'درسِ نظامی' درحقیقت وہ درس نظامی نہیں ہے جو ملا نظام الدین سہالویؒ نے ترتیب دیا تھا کیونکہ ملا صاحب نے جو نصاب بنایا تھا وہ دین و دنیا دونوں کے لیے تھا۔ وہ اُس وقت کے مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے بھی افراد تیار کرتا تھا، آج کے درس نظامی کی طرح صرف مسجد و مدرسہ کے لیے امام، خطیب اور مدرس تیار نہیں کرتا تھا۔

دوم: ہمارے دینی مدارس کا موجودہ نظام اور نصاب اس نظام اور نصاب کے خلاف ہے جو عالم اسلام میں ۱۲۰۰ سال تک رائج رہا ہے۔ گویا موجودہ درس نظامی (جو اس وقت پاک و ہند میں رائج ہے) اس نظام تعلیم و نصاب کے مطابق نہیں ہے جو ہمارے اسلاف ۱۲۰۰ سال تک مسلم دنیا میں پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں۔

* جب برصغیر میں انگریز نے اوقاف ختم کر کے اسلامی مدارس بند کر دیے اور قومی زبان فارسی کو ترک کر کے انگریزی رائج کر دی تو مدارس بند ہو گئے اور علماء بے کار ہو گئے۔ اس وقت علماء نے سوچا کہ اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو ہندوستان سے اسلام ختم ہو جائے گا لہٰذا انہوں نے مادی وسائل سے محرومی کے باوجود کچھ بنیادی علوم مساجد میں پڑھانے شروع کیے تا کہ نکاح طلاق اور غم و خوشی کی اسلامی رسوم معاشرے میں جاری رہ سکیں۔ تاہم چونکہ کافر حکومت کو کارکنان مہیا کرنا ان کے پیش نظر نہیں تھا اور نہ وسائل موجود تھے لہٰذا مجبوراً انہوں نے موجود نصاب کی تشکیل کی لیکن دیوبند کے قیام کے وقت بھی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو اس امر کا احساس

تھا کہ ان کا نصاب جزوی اور ناقص ہے اور انہوں نے اس کی بہتری کے لیے سوچا اور کچھ کرنے کی کوشش بھی کی (جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں)۔ بہر حال قیام پاکستان کے بعد ان دینی مدارس کے استمرار کا کوئی جواز نہ تھا لیکن چونکہ حکومت پاکستان نے نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے لیے کچھ نہ کیا لہٰذا علماء نے بھی اپنے مدارس پہلی ڈگر کے مطابق جاری رکھے، حالانکہ انہیں اصلاح کرنی چاہیے تھی اور وہ کر سکتے تھے۔ اس کا بہت زیادہ نقصان ہوا اور ہو رہا ہے لیکن کوئی از سر نو سوچنے کو تیار نہیں اور اہل مدارس مکھی پر مکھی مارتے چلے جا رہے ہیں۔ مدارس کے اس منہج کے نقصانات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کی وجہ سے ملک میں شریعت نافذ نہ ہو سکی، معاشرے میں مسٹر اور ملا کی تقسیم گہری ہو گئی، مدارس کے طلبہ کی اکثریت روزگار سے محروم رہی، ملک میں مسلک پرستی اور فرقہ واریت مستحکم ہوئی، ملک میں ایک طرح کا سیکولرزم پھیل گیا....وغیرہ وغیرہ۔

- مدارس کی ڈگریاں حکومت کی منظور شدہ نہیں۔ دینی مدارس مڈل یا میٹرک پاس بچے لیتے ہیں گویا ابتدائی تعلیم ان کے ہاتھ میں نہیں۔ آٹھ سالہ شہادت عالمیہ (مساوی ایم اے) کے بعد وہ بطور تخصص ایم فل و پی ایچ ڈی بھی نہیں کراتے۔ گویا نہ تعلیم کی ابتدا ان کے ہاتھ میں ہے نہ انتہاء۔ وہ درمیان سے بچے کو کچھ عرصے کے لیے اچک لیتے ہیں جو سینڈوچ بن کر رہ جاتا ہے۔

- دینی مدارس کی نصابی کتب صدیوں پرانی ہیں اور ان کا طریق تدریس بھی از کار رفتہ ہے۔

* موجودہ دینی مدارس کو صحیح دینی مدارس میں کیسے بدلا جائے؟ یا ایک ماڈل دینی مدرسہ کیسے قائم کیا جائے اور وہ کس قسم کا ہو گا؟ اس کے بارے میں ہم نے خوب سوچا اور لکھا ہے اور ہماری مندرجہ ذیل تین کتابیں اسی موضوع پر ہیں:

۱۔ ہمارا دینی نظام تعلیم
۲۔ نصاب مدنی
۳۔ اصلاحِ دینی مدارس

تلخیصاً عرض ہے کہ آج اگر کوئی مدرسہ کے ذریعہ تعلیمی ثنویت ختم کرنا چاہے اور ایسا مدرسہ قائم کرنا چاہیے جو صرف مسجد اور مدرسہ کے لیے آدمی تیار نہ کرے بلکہ معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن بھی تیار کرے اور دین و دنیا دونوں کے لیے جامع افراد بھی تیار کرے تو یہ ممکن ہے لیکن

اس کے لیے ضروری ہے کہ:

ابتداء سے مڈل یا میٹرک تک کی تعلیم بھی مدرسہ کے پاس ہو اور اس کا نصاب مدارس خود بنائیں جو ایسے عصری علوم پر مشتمل ہو جن کی تدوین اسلامی تناظر میں کی گئی ہو۔ درس نظامی (بمساوی ایم اے اسلامیات وعربی) کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی مدارس کے پاس ہو۔ طلبہ کے پاس حکومتی ڈگریاں بھی ہوں۔ ثانویہ عامہ وخاصہ کے بعد عالیہ اور عالمیہ میں دینی علوم میں تخصص کے ساتھ ’’عمرانی علوم‘‘ میں اسلامی تناظر میں تخصص کا اہتمام بھی یہ مدارس کریں۔ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ، جدید علوم کا تعارفی مطالعہ اور اسلام کا مطالعہ بطور نظام زندگی بھی موجودہ دینی نظام تعلیم کا حصہ ہونا چاہیے۔ مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ کسی ایک مسلک کے نہ ہوں تاکہ فرقہ واریت کے ماحول سے بچا جا سکے۔ موجودہ نصاب کو جامع بنایا جائے، اس میں نئے مضامین اور نئی کتابیں شروع کرائی جائیں۔ مدرسہ صرف متخصص علماء ہی تیار نہ کرے بلکہ عوام کی دینی تعلیم کا بھی انتظام کرے خصوصاً جدید تعلیم کے طلبہ اور پڑھے لکھے افراد کے لیے سہ پہر کے وقت ریگولر کورسز رکھے جائیں۔ ہر مدرسہ میں لائبریری اور کمپیوٹر لیب فعال ہو۔ ریسرچ کا اہتمام ہو۔

دینی مدارس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے جو علماء کرام (یا فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ) ہماری اس بات کو سمجھ جائیں انہیں چاہیے کہ وہ اس قسم کے مدرسے قائم کریں اور چلائیں۔ اور اگر وہ اس وقت کوئی مدرسہ چلا رہے ہیں تو اس کو ہماری مذکورہ بالا تجاویز کے مطابق تبدیل کریں تاکہ ان مدارس سے ایسے افراد تیار ہونے لگیں جو ہمارے زمانے کے آدمی ہوں اور عصر حاضر کے مسلم معاشرے کی رہنمائی کر سکیں۔

مجوزہ اصلاحی تحریک کے وابستگان کو چاہیے کہ وہ مذکورہ بالا خطوط پر جدید تعلیم کے اداروں اور دینی مدارس کی اصلاح کریں۔ اگر وہ خود کوئی تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں تو اسے بدلیں اور اگر ان میں سے کوئی نیا تعلیمی ادارہ یا نیا مدرسہ قائم کرنے کا سوچے تو مذکورہ اصولوں کو سامنے رکھے۔

دعوت

۔ دعوت کے لیے جمعہ کے خطبات کو فرقہ واریت سے مبرّا اور معاشرے کے زندہ مسائل کے حوالے سے مفید اور مؤثر بنایا جائے۔

مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کی اس تجویز پر عمل کیا جائے کہ ہر مدرسہ میں ایک داعی/مبلغ ہو جس

کا کام عوام میں دین کی دعوت وتبلیغ ہو، مدرسہ میں تدریس نہ ہو۔ ان مبلغوں کی ملک گیر نیٹ ورکنگ ہوتا کہ بوقت ضرورت ایک ہی موضوع پر سارے ملک میں بیک وقت دین کا پیغام پہنچایا جاسکے۔

- دینی مدارس صرف متخصص علماء ہی تیار نہ کریں بلکہ عوام کی دینی تعلیم، پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ افراد خصوصاً کالجوں یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے ریگولر دینی کورسز کا اجراء کریں کیونکہ سہ پہر کے وقت وہ اس کام کے لیے بآسانی وقت نکال سکتے ہیں۔
- پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر مؤثر دینی دعوت کے لیے سارے دینی عناصر مل کر ایک ملک گیر، مؤثر اور فعال پلیٹ فارم بنائیں اور چلائیں۔ علماء میں مسلکی اور سیاسی اختلافات ہوسکتے ہیں لیکن دین کے بنیادی امور جیسے قرآن وحدیث کی تعلیم، عبادات اور اچھے اخلاق کی ترغیب جیسے اساسی امور میں ان میں کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔
- دعوت دین کے لیے کوئی ایک سانچہ اختیار کرنے کی بجائے مختلف علمی اور سماجی سطحوں کے لیے الگ الگ گروپ اور منہج ہونے چاہئیں جیسے نوجوانوں کے لیے، خواتین کے لیے، ناخواندہ دیہاتیوں کے لیے، پڑھے لکھے افراد کے لیے، معاشرے کے معززین (جیسے جج، سیاستدان، سینئر بیوروکریٹ، ارکان سینٹ واسمبلی وغیرہ) اور پروفیشنلز (ڈاکٹرز، انجینئرز، پروفیسرز وغیرہ) کے لیے مختلف سطحوں کے لیے لٹریچر تیار کیا جائے۔
- دعوت کے لیے ذاتی ملاقاتوں کا اہتمام کیا جائے۔

اصلاحی تحریک سے اتفاق رکھنے والے لوگ جب دعوت دین کا کام کریں تو مندرجہ بالا تجاویز کو سامنے رکھ کر کریں۔

میڈیا

میڈیا سے مراد ہے پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا یعنی ذرائع ابلاغ کی آج کل کی مروج ساری صورتیں۔

میڈیا آج بہت بڑی قوت ہے۔ عالم کفر اس کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مؤثر طریقے

سے اور کامیابی سے استعمال کر رہا ہے لیکن مسلمان اس سے غافل ہیں بلکہ مغرب اور یہود وہنود کے میڈیا سے متاثر ہو کر اور ان کے آلۂ کار بن کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہے ہیں۔ اپنے اصول واقدار کی خود نفی کر رہے ہیں اور مسلم فرد، خاندان، معاشرے اور ریاست کو کمزور کر رہے ہیں اور اپنی اور دوسروں کی دنیا وعاقبت دونوں خراب کر رہے ہیں۔

ہمارے علماء کو سلیقے اور حکمت سے میڈیا کو استعمال کرنا نہیں آتا۔ عیار میڈیا والے انہیں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ دین کے فائدہ کی بجائے نقصان ہو۔ پھر بدقسمتی سے جو علماء اور دینی لوگ اس طرف آتے ہیں وہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو اساس بناتے ہیں اور بہت کم مفید اور تعمیری کام کر پاتے ہیں۔

اہل دین ودانش کو چاہیے کہ وہ میڈیا کو دینی تعلیم وتربیت کے لیے استعمال کریں۔ فرقہ واریت سے بچیں اور سیاسی، مسلکی، فروعی اختلافات سے بالاتر ہو کر اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کام کریں۔ .... تفریح اور انٹرٹینمنٹ کو اسلامی اصولوں کے تحت رکھیں۔ محب دین مخیر حضرات مل کر ان کو فنڈز مہیا کریں تاکہ میڈیا کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

’اصلاحی تحریک‘ کی فکر سے اتفاق رکھنے والے جو لوگ میڈیا میں کام کرنے کا ذوق یا صلاحیت رکھتے ہوں، انہیں مذکورہ بالا اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے۔

تزکیۂ نفس

- تزکیۂ نفس دین اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم کتاب وحکمت کا حاصل بھی یہی ہے۔ دین کا نصب العین جب عبودیت (عبادت واطاعت) ہے تو تزکیۂ نفس اس کا اساسی ذریعہ ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب ہے نفس انسانی کی ایسی تشکیل، تربیت اور اصلاح کہ وہ برغبت کارِ عبودیت انجام دینے لگے۔

- مسلمانوں نے تزکیۂ نفس کے لیے جو ادارہ تصوف کے نام سے بنایا تھا، اس میں غیر اسلامی افکار اور غیر شرعی رسوم ورواج کی بھر مار نے اسے ناقابل قبول بنا دیا ہے۔ وراثتی نظام، جاہل پیروں اور حب جاہ ومال کے اسیر گدی نشینوں نے اسے یرغمال بنا رکھا ہے، اگرچہ اِکا دُکا اچھے افراد اب بھی اس میں مل جاتے ہیں۔

۔ جس شخص میں مندرجہ ذیل خوبیاں نہ ہوں وہ صحیح مربی نہیں ہوسکتا:

وہ نہ صرف شریعت پر عامل ہو بلکہ دین کا عالم ہو اور ماہر علم النفس ہو۔ عصر حاضر کے انسان کے مائنڈ سیٹ کو سمجھتا ہو، لوگوں سے پیسے نہ لیتا ہو، ووٹ نہ مانگتا ہو۔ غیر معمولی تعظیم نہ کراتا ہو۔ مخلص ہو اور اسے لوگوں کو دین پر عمل کی ترغیب دینے کا ہنر آتا ہو۔ اس کا ہدف صرف ایک ہو کہ اس کے پاس آنے والے دین پر عمل کرنے لگ جائیں۔

۔ عصر حاضر میں مستحق افراد کو تزکیۂ نفس میں مدد دینے کے لیے ایک نئے ادارے کی تشکیل ضروری ہے جس کے لیے ایک نئی ’’تربیت گاہ‘‘ قائم کی جانی چاہیے جو روایتی خانقاہ کی ساری خرابیوں سے پاک ہو۔ یہ ایسی جگہ ہو جہاں طالبان تزکیہ کچھ عرصہ آ کر قیام کریں، مربی سے دین سیکھیں بلکہ دین پر عمل کرنا سیکھیں اور واپس جا کر اس پر عمل کریں۔ یہاں رہائش اور کھانے کا انتظام ہو۔ تنظیمی معاملات باہم مشاورت سے طے کیے جاسکتے ہیں۔ بنیادی ضرورت یہ ہے کہ شہروں کی ہماہمی اور تجارتی مراکز سے ذرا دور کسی کھلی جگہ مسجد ہو، اس کے ساتھ تعلیم و رہائش کے لیے کچھ کمرے ہوں، چھوٹی سی لائبریری ہو اور مربی ہو۔

یہ ذہن میں رہے کہ آج کل کئی لوگوں اور دینی گروہوں کا تصورِ دین، تزکیۂ نفس کے حوالے سے، غیر متوازن ہوگیا ہے۔ وہ نہ تزکیۂ نفس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کے لیے کسی ’تربیت گاہ‘ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ بعض لوگ دین کو دنیا میں زندگی گزارنے کا محض ایک ’نظام‘ سمجھتے ہیں اور عبودیت میں صرف ’اطاعت‘ پر زور دیتے ہیں اور ان سے اس بات سے صَرفِ نظر ہو جاتا ہے کہ اسلام درحقیقت ایک آخرت Oriented دین ہے یعنی اس میں آخرت کو دنیا پر ترجیح حاصل ہے اور اصل چیز تعلق باللہ اور قرب الٰہی ہے جس کی بنیاد خوف آخرت ہے۔ اور ’عبادت‘ (یعنی پرستش) کے بغیر اطاعت بھی نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح بعض لوگ عبادت کے صرف ظاہری اعمال پر اکتفا کر لیتے ہیں اور اس چیز کی پروا نہیں کرتے کہ انہیں اس سے شریعت کے مقاصد حاصل ہو بھی رہے ہیں یا نہیں؟ مثلاً وہ نماز پڑھتے ہیں لیکن خضوع وخشوع کو اہمیت نہیں دیتے یا روزہ رکھتے ہیں لیکن نہیں دیکھتے کہ انہیں صرف بھوک پیاس حاصل ہوئی تقویٰ حاصل نہیں ہوا۔

- خلاصہ یہ کہ تزکیۂ نفس حاصلِ دین اور مغزِ دین ہے۔ جو شخص سلیم الطبع ہو، دینی تعلیمات سے واقف ہو اور ان پر کما حقہ عمل کر رہا ہو، اسے مقاصد شریعت حاصل ہو رہے ہوں، وہ گویا نفس مزکیٰ رکھتا ہے، اسے کسی مربی اور تربیت گاہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو شخص معصیت میں مبتلا ہو، اللہ کی نافرمانیاں کر رہا ہو اور اپنی پوری ذاتی کوشش کے باوجود معصیت کی اس دلدل سے باہر نہ آ پا رہا ہو تو اس کے لیے بہت ضروری ہے، بلکہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ کسی مربی کو تلاش کرے اور اس کی مدد لے یا کسی تربیت گاہ میں جائے اور ہر قیمت پر معصیت سے بچنے کی جدوجہد کرے کیونکہ اسی پر اس کی آخرت میں کامیابی کا مدار ہے، اسی پر جہنم کی آگ سے بچنے کا مدار ہے۔ ایسی اہم بات سے صَرفِ نظر کیسے کیا جا سکتا ہے؟

- اصلاحی تحریک سے متعلق جو لوگ اس کا ذوق اور صلاحیت رکھتے ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی اصلاح کے بعد/ ساتھ وہ نئی طرز کی تربیت گاہ قائم کریں یا جو اسے قائم کرنا اور چلانا چاہتے ہیں ان کی مدد کریں۔

اصلاحِ معاشرہ

معاشرہ کی اصلاح دو طرفہ عمل ہے یعنی کچھ اصلاح یافتہ افراد ہوں گے تو وہ معاشرتی اصلاح کا کام کریں گے اور معاشرتی اصلاح کے پراسیس سے بھی افراد کی اصلاح ہوگی۔ معاشرتی اصلاح کے چند بڑے ذرائع اور مظاہر درج ذیل ہیں:

معاشرتی تنظیم اور اداراتی صف بندی کے ذریعے

- یہ وہ کام ہے اسوۂ نبوی اور منہجِ صحابہ ہے۔ اس کا ایک عنوان خدمت خلق بھی ہے۔ یہ کام ہمارے اسلاف نے صدیوں پہلے شروع کیا تھا جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ مظلومانہ شہید ہو گئے تو اسلاف نے یہ سوچا کہ حکومتی اصلاح کے لیے قوت استعمال کرنے کی بجائے پُر امن طریقے اختیار کیے جائیں اور زیادہ توجہ تعلیم و تزکیہ اور فقہ و افتاء کو دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے دینی مدارس اور خانقاہیں قائم کیں اور فقہ و افتا کی مشغولیت اختیار کی اور یہ کام حکومتی وسائل اور نگرانی کی بجائے معاشرے کی مدد سے شروع کیے۔ یوں یہ کام وہ صدیوں آزادانہ کرتے رہے بلکہ آج بھی یہ ہمارے معاشرے میں معاشرتی تنظیم کے ذریعے ہو رہے

ہیں۔ پہلے مسلمان حکومتیں ان کی مالی سپورٹ کرتی تھیں، یورپی استعمار کے مسلم معاشروں پر تسلط کے بعد حکومتی مالی سپورٹ بھی ختم ہوگئی اور اب ہماری مساجد و دینی مدارس صرف عوامی چندے سے چلتے ہیں۔

- ہماری اس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ہماری مساجد اور دینی مدارس آج بھی معاشرتی تنظیم کے ذریعے چل رہے ہیں، اس پر قیاس کرتے ہوئے دوسرے کام بھی منظم کیے جائیں۔ شروع شروع میں یہ معاشرے کو اوپرے اور نامانوس لگیں گے لیکن بتدریج یہ ہونے لگیں گے اور پھر مستحکم ہو جائیں گے، ان شاء اللہ۔

- یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بدقسمتی سے اکثر مسلم ممالک میں حکمران ایسے ہیں جو اس طرح کے دینی و معاشرتی کاموں کی سرپرستی نہیں کرتے۔ لہٰذا دینی جماعتوں اور تحریکوں کا صرف حکومتوں سے انہیں کرنے کا مطالبہ کرتے رہنا کافی نہیں ہے بلکہ انہیں چاہیے کہ آگے بڑھ کر عوامی حمایت اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے ان پر عمل درآمد کریں۔

- ضروری ہے کہ مسجد کو ان کاموں کا مرکز بنایا جائے۔ اس کے کئی فائدے ہوں گے مثلاً جو لوگ اس میں حصہ لیں گے ان کا نمازی ہونا یقینی ہوگا اور اس سے عوام میں ان کی قبولیت کی راہ جلد ہموار ہوگی۔ مسجد کا وہ استعمال شروع ہوگا جو دورِ نبوی میں تھا۔ امام مسجد اور خطیب مذہبی سرگرمیوں کے علاوہ معاشرتی اور اصلاحی سرگرمیوں میں شریک ہوں گے اور لوگ نماز کے علاوہ معاشرتی سرگرمیوں کے لیے بھی مساجد کا رُخ کریں گے جو بالواسطہ ان کو دین دار اور نمازی بنانے میں ممد و معاون ہوں گی۔

- اس طرح جو اہم کام کیے جا سکتے ہیں ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

فراہمیٔ عدل وانصاف

نمازیوں میں سے کسی ریٹائرڈ جج، دین دار وکیل، ریٹائرڈ سرکاری افسر اور امام/خطیب پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جائے جو لوگوں کے جھگڑوں میں ثالثی کا کام کرے، عدالتوں میں جانے سے پہلے فریقین میں صلح کی کوشش کرے اور چھوٹے موٹے جھگڑوں کے فیصلے کرے۔ اس طرح

کے فیصلوں کے خلاف اپیل کے لیے شہر کی سطح پر ایک اپیل کمیٹی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ مساجد میں اس طرح کی ثالثی کمیٹی/ مصالحتی کمیٹی شرعی عدالت کے کئی فائدے ہوں گے۔ مسجد کے تقدس کی وجہ سے لوگ جھوٹ کم بولیں گے، حلف کی بنیاد پر فیصلے ہو سکیں گے، لوگوں کے پیسے اور وقت بچے گا۔ عدالتوں پر بوجھ کم ہوگا۔ یہ کمیٹی فی سبیل اللہ کام کرے گی۔

غریبوں کی مدد

علاقے کے تین چار معزز نمازیوں پر مشتمل ایک فلاحی یا مالیاتی کمیٹی بنا دی جائے جو محلے کی بیواؤں یتیموں، مسکینوں کی فہرست تیار کرے۔ محلے کے کھاتے پیتے گھروں سے ماہانہ زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات اکٹھی کرے اور ان مستحقین تک پہنچائے۔ یہ کمیٹی غربت میں کمی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ جب یہ کام محلے کی سطح پر منظم ہو جائے تو شہر، صوبے اور ملک گیر سطح پر ایک زکوٰۃ وصدقات کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جس میں ایسے لوگ شامل ہوں جو اپنی نیک نامی کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک قابل اعتماد ہوں اور لوگ اپنے زکوٰۃ وصدقات ان کے پاس جمع کرائیں جن سے غربت میں کمی کے بہت سے اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ چھوٹے بزنس کے لیے غیر سودی قرضے دیے جا سکتے ہیں اور بے روزگاری میں کمی آسکتی ہے۔ ''اخوت'' کا کام اس کی ایک مثال ہے۔

بحالیٔ امن وامان کمیٹی

محلے میں امن وامان کے لیے مسجد کے نمازی ایک امن کمیٹی قائم کرلیں۔ کچھ چیدہ نوجوانوں کی ڈیوٹی لگائی جائے کہ وہ باری باری جاگ کر رات کو پہرہ دیں۔ ریٹائرڈ بزرگوں کی ڈیوٹی لگائی جائے کہ وہ نماز کے لیے آتے جاتے سٹریٹ کرائم کا خیال رکھیں کہ کوئی لفنگا کسی عورت سے پرس نہ چھینے، گلیوں میں آوارہ لڑکے اکٹھے کھڑے ہو کر آتی جاتی عورتوں پر آوازیں نہ کسیں یا محلے کے باغیچے میں بیٹھ کر چرس نہ پئیں۔ یا اگر محلے میں مختلف مسلکی، لسانی، علاقائی، سیاسی گروپوں کے لوگ رہتے ہیں تو ان میں تناؤ اور کشیدگی پیدا نہ ہو اور اگر ہو تو بروقت افہام وتفہیم سے کام لے کر مسئلے کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔

ثقافتی کمیٹی

نمازیوں میں سے برسر کار یا ریٹائرڈ اساتذہ، ادیب، صحافی وغیرہ ہوں تو ان پر مشتمل ایک

ثقافتی کمیٹی بنائی جاسکتی ہے جو بچوں، نوجوانوں اور ریٹائرڈ لوگوں کو تعمیری طور پر مصروف رکھنے کے لیے مختلف ادبی، تفریحی اور ثقافتی پروگرام بنائے۔ کسی گھر کے ڈرائنگ روم میں پبلک لائبریری بنائی جاسکتی ہے جہاں محلے کے لوگ اخبار و جرائد اور کتابوں کا مطالعہ کریں۔ محلے کے سکول میں استقبالِ رمضان، یومِ اقبال وغیرہ کے جلسے رکھے جاسکتے ہیں۔ محلے کے پارک میں کھیلیں منظم کی جاسکتی ہیں۔ کسی گھر کے ڈرائنگ روم میں درس قرآن وحدیث کا انتظام کیا جاسکتا ہے اور فری ٹیوشن سنٹر کھولے جاسکتے ہیں۔

تعلیم وتربیت کمیٹی

تعلیمی مسائل کے حل کے لیے مسجد میں ایک تعلیمی کمیٹی بنائی جاسکتی ہے۔ مسجد کو ابتدائی تعلیم کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر محلے میں سکول کی گنجائش ہو تو مل کر سکول کھولا جاسکتا ہے۔ اور اسے اس طرح اسلامی اصول واقدار کے مطابق چلایا جائے جن کی وضاحت ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں اور جس کا تفصیلی ناک نقشہ ہماری کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آج کل تعلیم کا مسئلہ یہ ہے کہ جدید تعلیم مہیا کرنے والے اکثر سکول انگریزی میڈیم ہیں اور بچوں کو اسلامی اقدار کی بجائے مغربی اقدار سکھاتے ہیں جیسے انگریزی لباس پہننا، ٹائی لگانا، السلام علیکم کی بجائے Good Morning کہنا، لڑکیوں کا سکارف لینے کی بجائے سر کھلا رکھنا، مہنگی فیسیں، مخلوط تعلیم.....وغیرہ۔ ایسی سکول انتظامیہ سے مل کر اسے توجہ دلائی جاسکتی ہے کہ وہ اسلامی اصول واقدار کا خیال رکھے کیونکہ یہ معاشرہ مسلمانوں کا ہے اور ہم اپنے بچوں کو اچھا مسلمان بنانا چاہتے ہیں، کالے انگریز نہیں۔ اسی طرح محلے کی مسجد میں اور اگر دینی مدرسہ ہو تو اس میں، بچوں اور بڑوں کے لیے موزوں دینی تربیتی پروگرام رکھے جاسکتے ہیں جن کی طرف اس وقت لوگوں کی زیادہ توجہ نہیں ہے۔ اس کمیٹی کے تحت غریب بچوں کے لیے فری ٹیوشن سنٹر کھولے جاسکتے ہیں اور ٹیوشن سنٹر چلانے والوں کو توجہ دلائی جاسکتی ہے کہ وہ بچوں کو نماز باجماعت کے لیے مسجد میں لایا کریں اور دوسرے پہلوؤں سے ان کی دینی تربیت کریں۔

اسی طرح خدمت خلق کے لیے، غلط رسوم ورواج کی اصلاح کے لیے اور برے اخلاق سے بچنے کے لیے بھی مساجد میں خصوصی کمیٹیاں بنائی جاسکتی ہیں۔ گراس روٹ لیول کے یہ کام خاموش سے کرنے چاہئیں تاکہ اسلام مخالفوں اور مغربی تہذیب اور سیکولرزم ولبرلزم کے

علمبرداروں کو مخالفانہ پروپیگنڈے کا موقع نہ ملے کہ ریاست کے اندر ریاست بنائی جا رہی ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے اس طرح کے کام بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے دور رس اثرات نکل سکتے ہیں مثلاً صرف اس ایک بات کر لیں کہ اگر لوگوں کو اس طرف مائل کیا جائے کہ وہ نکاح اور شادی میں ہندوانہ رسوم چھوڑ کر سادگی اختیار کریں، نکاح مسجد میں کر لیں تو بہت سے معاشی و معاشرتی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

انتہائی اہم

بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر ان تدابیر پر عمل کیا جائے تو بڑی حد تک اسلام معاشرے میں نافذ ہو جائے گا۔ سڑکوں پر ’اسلامی انقلاب‘ کے نعرے لگانے اور ’’شریعت نافذ کرو‘‘ کے بینر لگانے سے یہ کہیں زیادہ مفید اور مؤثر ہے کہ ان طریقوں سے اسلام پر عمل درآمد کے معاشرتی ادارے بنا دیے جائیں تا کہ اگر حکومت نفاذ شریعت کی ذمہ داری نہ بھی پوری کرے تو معاشرہ اسلامی شریعت کی برکات سے محروم نہ رہے اور افرادِ معاشرہ کو دین پر عمل میں مدد دینے کے لیے خود ان کا اپنا اختیار کردہ مکینزم مؤثر اور فعال صورت میں موجود رہے۔

ہمارے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حکومت یہ کام نہ کرے یا حکومت سے یہ کام کرنے کا مطالبہ نہ کیا جائے اور نہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اس غرض سے سیاسی جدوجہد نہ کی جائے کہ ایسے لوگ حکمران بنیں جو یہ کام اپنی دینی اور سیاسی ذمہ داری سمجھ کر کریں۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ جب ہمارا ۷۰ سال کا تجربہ یہ ہے کہ حکمران یہ کام نہیں کر رہے تو پھر یہ کام معاشرتی تنظیم کے ذریعے ہم خود کیوں نہ کریں؟

ہم ’اصلاحی تحریک‘ کے معاونین سے درخواست کریں گے کہ جہاں تک ان کے لیے ممکن ہو، وہ معاشرتی تنظیم کے ذریعے مساجد کو مرکز بنا کر یہ کام ضرور کریں۔ (جاری ہے)

قافلے ریت ہوئے دشتِ جنوں میں کتنے
پھر بھی آشفتہ سروں کا سفر جاری ہے

تفہیم اسلام

ڈاکٹر محمد امین

جدید ٹیکنالوجی ۔ قرآن کے لیے چیلنج نہیں

البرہان کے ایک قاری نے ہمیں خورشید ندیم صاحب کا روزنامہ ’دنیا‘ میں طبع ہونے والا ۲۳ جنوری ۲۰۲۱ء کا کالم بعنوان ’’سائنس اور نئے علم کلام کی ضرورت‘‘ بھیجا ہے اور اس پر تبصرے کی درخواست کی ہے۔

’زندگیٔ نو‘ دہلی میں مطبوعہ ڈاکٹر رضوان احمد صاحب کے جس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے خورشید ندیم صاحب نے اپنا کالم لکھا ہے، وہ ہماری نظر سے بھی گزرا تھا۔ اتفاق سے ’البرہان‘ پریس میں جانے کے لیے تیار تھا چنانچہ ہم نے اسے اپنے قارئین کے لیے منتخب کیا اور پرچے میں طبع کر دیا۔ ہمارا خیال تھا، ہمارے پاس مہینہ پڑا ہے، اس پر کچھ تھوڑی بہت تحقیق کریں گے اور اگلے ماہ کے شمارے میں اس پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔ روزنامہ اخبار میں کالم لکھنے کے لیے جوزودنویسی درکار ہے، اس کے لیے لگتا ہے خورشید ندیم صاحب نے وہ مضمون پڑھا اور قلم برداشتہ مضمون لکھ دیا۔ روزنامہ اخبار میں کالم تو رہا ایک طرف اب تو فیس بک اور ٹویٹر نے ’’فوراً لکھو اور مختصر لکھو‘‘ کا ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ اس میں حصہ لینا تو درکنار اسے دیکھ کر ہی طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ ہم اپنا تجربہ عرض کرتے ہیں کہ راقم ایک سال بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے اسلام آباد میں مقیم رہا چونکہ فیملی ساتھ نہ تھی، اس لیے وقت کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ راقم نے ’نوائے وقت‘ کے میگزین والے صفحے کے لیے ’’فکرونظر‘‘ کے عنوان سے ایک کالم لکھنا شروع کیا لیکن وہ بھی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ جب اس کے بعد راقم نے جامعہ پنجاب کے دائرہ معاف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) میں ملازمت شروع کی تو وہاں ماحول یہ تھا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے طالبان تحقیق کے لیے جہازی سائز کی میزیں بنوائی تھیں تا کہ آٹھ دس کتابیں بیک وقت سامنے پھیلائی جاسکیں اور ساتھ گھومنے والا ریک مہیا کیا تھا کہ پچیس تیس کتابیں ہر وقت تحقیق کار کی دسترس میں رہیں۔ ادارے کی لائبریری میں امہات الکتب بھی میسر تھیں۔ دائرہ معارف میں مقالہ لکھنے کے لیے بھی وقت کی قید نہ تھی۔ اس تحقیقی ماحول نے وہ ہفتہ

وار کالم ہم سے ایسا چھڑوایا کہ دوبارہ بحال نہ ہو سکا۔ سو ہماری رائے یہ ہے، چلیے اسے ہمارا ذوق کہہ لیجیے کہ نالے کو رسا باندھنے کے لیے اسے سینے میں کچھ دیر تھامے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں تو اپنے ماہنامے میں ایک ماہ کے اندر لکھنا بھی بعض اوقات دوبھر محسوس ہوتا ہے۔ چلیے خورشید ندیم صاحب ہماری نہ سنیں، اپنے استاد گرامی کی سن لیں۔ ہمیں ۸۸۔۱۹۸۷ء میں ایک سال جاوید احمد غامدی صاحب کے ساتھ دن رات کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ہمیں جاوید صاحب کے نتائج فکر سے اختلاف نہیں، سخت اختلاف ہے لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انہوں نے جو لکھا ہے وہ ''اتاولے پن'' میں نہیں لکھا۔ برسوں نہیں اس پر عمر بھر غور کیا ہے اور پھر لکھا ہے۔ اب اتنا لکھنے کے بعد ہم خورشید صاحب کے مضمون پر کیا تبصرہ کریں؟ کچھ تاثرات کا اظہار کیے دیتے ہیں۔

۱۔ دیکھیے! ''سائنس'' اور ''مذہب'' دونوں کے بارے میں خورشید ندیم صاحب نے جو مقدمات قائم کیے ہیں، وہ مخدوش ہیں۔

- جدید سائنس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کسی ورلڈ ویو پر مبنی نہیں، تجاہل عارفانہ ہے۔ مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کو مذہب و اقدار کش اور مبنی بر مغربی ورلڈ ویو کہنے والے تھامس کوہن اور ہائیڈیگر اور دوسرے بیسوں مغربی دانشوروں کی تحقیقات دیکھنے کی فرصت اگر ہمارے بھائی کو میسر نہیں تو کم از کم ڈاکٹر زاہد صدیق مغل کی ''مقالات تفہیم مغرب'' ہی دیکھ لیں۔ ہم چند جملوں میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتے کہ مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی Value-neutral نہیں ہے بلکہ مغربی فلسفۂ علم کی پیداوار ہے اور اس فلسفۂ علم کے مآخذ (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم وغیرہ) سراسر الحادی ہیں۔ لہٰذا مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی کو Value-neutral نہیں کہا جا سکتا۔

- جب اسلامی اور قرآنی مفاہیم زیر بحث ہوں تو جدید ٹیکنالوجی کو 'مذہب' کے لیے چیلنج باور کرانا، بالواسطہ طور پر، قرآن حکیم میں تشکیک پیدا کرنے کے مترادف ہے حالانکہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو تشکیک سے مبرا ہے کیونکہ اس کے مصنف نے اس کی ابتداء ہی "لاریب فیہ" کے دعوے سے کی ہے اور چونکہ مَیں مسلمان ہوں لہٰذا دل کی جتنی گہرائی اور ذہن کا جتنا تعقل مجھے میسر ہے، اس کی بناء پر میرا پورا یقین ہے کہ اس کتاب کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ اور یہ دنیا کی

واحد کتاب ہے جس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کا مصنف ''العلیم'' اور ''الخبیر'' ہے، وہ منبعِ علم ہے، وہ خالقِ علم ہے لہٰذا 'مذہب' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے یہ جھلک دکھانا کہ قرآن کا کوئی تصور قابل چیلنج ہے، ناروا ہے۔

رہی بات 'علم کلام' کی (اور اسی پر قیاس کر لیجیے فقہ کو اور تفسیر کو) تو بھائی یہ جامد کب تھا؟ جس علم کی بنیاد انسانی ذہن ہو وہ جامد کیسے ہوسکتا ہے؟ علم کلام کیا ہے؟ قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے ایمانیات کی تشریح اور وضاحت، انہیں عصری اسلوب میں دلائل کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ ان کا حق ہونا مبرہن ہوجائے۔ ظاہر ہے اس کا اسلوب بھی زمانے کے ساتھ بدلتا رہے گا اور دلائل بھی۔ یعنی قرآن وسنت کے بیان کردہ ایمانیات پر جس زمانے میں جس طرح کے شبہات واعتراضات مخالفین وارد کریں گے، ان کا مسکت اور مدلل جواب دینا ہی علماء علم الکلام کا کام ہے اور ظاہر ہے اس کام کا اسلوب اور اس کے دلائل زمان ومکان کے ساتھ بدلتے رہیں گے اور بدلتے رہنے چاہئیں لہٰذا قدیم کی بوسیدگی کی بحث بے جواز ہے۔

ماضی میں معتزلہ نے یونان کے الحادی فکر وفلسفہ سے متاثر ہوکر جو سوالات مسلم ایمانیات پر اٹھائے تھے، الحمدللہ مسلم علماء نے ان کے مسکت اور مدلل جوابات دیے اور آج مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب اور اس کے علوم (بشمول سائنس وٹیکنالوجی) سے مرعوب ومتاثر ہوکر جو سوالات مستشرقین یا مستغربین ومتجددین اٹھا رہے ہیں، صحیح الفکر علماء ان کے مدلل اور مسکت جوابات دے رہے ہیں اور آئندہ بھی دیں گے، ان شاء اللہ۔ ہم کہتے ہیں کہ علمی وفکری چیلنج بلاشبہ موجود ہے لیکن وہ قرآن کے لیے نہیں بلکہ مسلم علماء علم الکلام کے لیے ہے۔ اور یہ چیلنج نیا نہیں مغربی فکر وتہذیب کے علمی وفکری بلکہ عملی غلبے کی وجہ سے یہ چیلنج پہلے سے موجود ہے اور مسلم اہل علم اس کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ جو احباب یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم اہل علم اس کا حق ادا نہیں کر پائے یا نہیں کر پا رہے، وہ خود میدان میں آئیں اور یہ کام کریں۔ کس نے ان کے ہاتھ پکڑے ہیں؟ لیکن مستشرقین ومستغربین ومتجددین کے مسلم ایمانیات کے بارے میں اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب نہ دینا اور الٹا جمہور علماء کو متہم کرنا کہ وہ صحیح کام نہیں کر رہے یا نہیں کر سکتے اور بالواسطہ طور پر ان سوالات واعتراضات وشبہات کو ہوا دینا کون سا کارِ خیر ہے؟

۲۔ اس اصولی بحث کے بعد اب کچھ اصولی باتیں کرسپر ٹیکنالوجی کے حوالے سے:

- تجربات چوہوں پر ہوئے ہیں اور نتائج کا اطلاق انسانوں پر کیا جا رہا ہے۔ کیا یہ قیاس مع الفارق نہیں؟ کیا یہ فقہ تقدیری نہیں؟ یعنی معاملہ ابھی واقع نہیں ہوا لیکن اس سے نتائج پہلے مستنبط کیے جا رہے ہیں اور اس سے ممکنہ طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا جواب پہلے مانگا جا رہا ہے۔

- اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے جو اسکیم وضع کی ہے یعنی انسان کو صاحبِ اختیار بنا کر اور مکلف ٹھہرا کر اور دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزا بنانے کی جو اسکیم تیار کی ہے وہ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ انسان اس میں رخنہ نہیں ڈال سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ انسان کا اور اس کائنات کا خالق و مالک ہے، وہ العزیز ہے، مہیمن ہے، قیوم ہے، جبار ہے، مقتدر ہے، اس کی قوت اور اختیارات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ وہ جو کہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔

البتہ انسان کو یہ اختیار اسی نے دیا ہے کہ وہ اس اسکیم سے انحراف کر سکتا ہے، اس میں بگاڑ پیدا کر سکتا ہے، اس کا انکار کر سکتا ہے۔ خدا کی خدائی کا انکار کر سکتا ہے۔ اس انحراف و انکار سے وہ زمین میں فساد برپا کر سکتا ہے، اللہ کے مقابلے میں اپنی من مانی کر سکتا ہے۔ لیکن معاف کیجیے گا اس سے نہ اس کا بھلا ہوگا، نہ دنیا کا۔ مثلاً انسان نے مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے زیر اثر غیر اسلامی، غیر فطری حرکت کی کہ فیملی پلاننگ اور تحدید آبادی اور کم بچے پیدا کرنے پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ یورپ و ایشیا میں کیا نکلا؟ انسان نے خود کو جنسی حیوان بنا لیا تو اس کا فائدہ کیا ہوا؟ اس نے فرد کو شتر بے مہار بنا کر خاندان کا نظام تباہ کر ڈالا تو اسے کیا حاصل ہوا؟ اب جینٹنگ انجینئر نگ اور کرسپر ٹیکنالوجی استعمال کر کے وہ کیا تیر مار لے گا؟ اسلام اور فطرت سے انسان جتنا انحراف کرے گا، اور وہ کر سکتا ہے کہ یہ خدائی اسکیم ہے، لیکن میرے بھائی! اس میں اسلام کے لیے کوئی چیلنج نہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں اس کا نتیجہ ہے "مَعِيْشَةً ضَنْكًا" جس کا مشاہدہ ہماری آنکھیں کر رہی ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ آسودہ، خوشحال، امیر، سائنس اور ٹیکنالوجی کی مہیا کردہ سہولتوں اور تعیّشات سے آراستہ، سب سے زیادہ آزاد اور اپنی من مانی کرنے پر قادر انسان امریکہ (و یورپ) میں ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ ناخوش انسان بھی وہیں ہے۔ سب سے

زیادہ منشیات وہیں استعمال ہوتی ہے، سب سے زیادہ نفسیاتی ہسپتال، پاگل خانے اور اولڈ ہوم وہیں ہیں، سب سے زیادہ جرائم وہیں ہیں، سب سے زیادہ خودکشیاں وہیں ہیں اور دنیا کی اس طرح کی زندگی کے بعد آخرت میں جہنم اور آگ کا عذاب ۔ العیاذ باللہ۔ یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا۔ خورشید ندیم صاحب ہمیں کس ٹیکنالوجی کی کامیابی کی نوید سنا کے مذہب کو چیلنج کر رہے ہیں؟

– پھر یہ نہ بھولیے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا یقین ہے کہ خالق نے ہر انسان کی تقدیر لکھ دی ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے اور سیاہی خشک ہوگئی۔ اور بظاہر جو تبدیلی ہوتی ہے، ہمیں تو پتہ نہیں ہوتا لیکن وہ ہماری تقدیر ہی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی بیمار ہوتا ہے۔ یہ اس کی تقدیر ہے۔ لیکن پھر کسی علاج سے یا دعا سے اسے صحت ہو جاتی ہے تو یہ بھی تقدیر ہی ہے لیکن ظاہر ہے ہمیں پتہ نہیں ہوتا کہ ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فجور و تقویٰ بلکہ خود خدا کا تصور (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟) انسان کی سرشت میں رکھ دیا، لکھ دیا۔ اب اگر انسان اس سے انحراف کرتا ہے، مغرب کے الحادی فکر و فلسفے سے متاثر ہو کر یا اس کی سائنس و ٹیکنالوجی استعمال کر کے تو یہ بھی متعلقہ فرد کی تقدیر ہے جو پہلے سے اللہ نے لکھ رکھی ہے یہ اللہ کے لیے اور اس کی اسکیم کے لیے چیلنج نہیں ہے۔

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اللہ کرے یہ سطور معاملے کی صحیح تفہیم میں معاون ہوں۔

قارئین کرام متوجہ ہوں

تحریک اصلاحِ تعلیم بعض تعلیمی و تربیتی پروگراموں کی تنفید کا سوچ رہی ہے۔ البرہان کے ہم خیال افراد میں سے جو اصحاب بلا معاوضہ یا با معاوضہ فل ٹائم یا پارٹ ٹائم وقت دے سکتے ہیں، وہ اپنے کوائف ارسال فرمائیں۔ شکریہ

مدیر

تفہیمِ مغرب

سید ذیشان ارشد

ٹیکنوسائنس....ایک تجزیہ

آج ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ذہنوں پر سائنسی علمیت کا غلبہ اور روزمرہ زندگی میں مکمل طور ٹیکنالوجی پر انحصار ہے اور ایک عام آدمی کا ٹیکنالوجی کے بغیر زندگی کو تصور کرنا ممکن نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کا ٹیکنالوجی سے مرعوب ہوجانا اور سائنس و ٹیکنالوجی کے تاریخی تصورات سے ناآشنائی کے باعث ان پر کوئی حتمی اسلامی رائے کا نہ رکھ پانا ایک فطری امر ہے۔

اس مضمون میں ہماری یہ کوشش ہوگی کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے تاریخی فرق کو واضح کریں، ٹیکنالوجی اور اقدار کے تعلق کے بارے میں بتائیں اور موجودہ دور کی ٹیکنالوجی یعنی ٹیکنوسائنس کی تفصیل اور بنیادی قدر بیان کریں۔ اُمید ہے کہ ان تصورات کے واضح ہوجانے کے بعد اہل ایمان کے لیے موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کے چیلنجز اور خطرات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کا تاریخی فرق

جدید سائنس کی ابتداء جدیدیت کے سائنسدانوں سے ہوتی ہے۔ جدید سائنس کو وحی کی متبادل علمیت تصور کیا جاتا ہے اور انسانی کلیات پر مبنی اس ذریعۂ معلومات کا دارومدار سائنٹفک میتھڈ پر ہے۔ اس مخصوص سائنٹفک میتھڈ پر مبنی سائنس کی تاریخ کی اس سے پہلے کوئی مثال موجود نہیں البتہ اس کے کچھ حصوں کی جڑیں قدیم یونانی فلسفے میں تلاش کی جاسکتی ہیں جبکہ دوسری جانب لفظ ٹیکنالوجی کا ماخذ ٹیکنیک یعنی تدبیر ہے اور انسانی تاریخ میں متعدد روزمرہ مسائل کے لیے مختلف معاشروں سے کئی تدابیر ثابت ہیں مثلاً ہر تہذیب نے اپنے طور پر گھر، برتن، ہتھیار اور اوزار بنانے کے فن سیکھے اور سکھائے اور تدابیر اختیار کیں۔ یہی بات تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے اور جوتوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ مختصراً یہ کہ مختلف طرح کے مسائل ہوں یا بیماری، ہر زمانے اور تہذیب کے لوگوں نے ان سے نمٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور اختیار کی۔ جو تدابیر سہل اور فائدہ مند تھیں وہ مقبول عام ہوئیں جبکہ اکثر آہستہ آہستہ ناپید ہوگئیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے

معاملات، مسائل کے حل اور مشاغل کے فروغ کے لیے اختیار کی گئی تدابیر اس زمانے کی ٹیکنالوجی قرار پائی۔ مثال کے طور پر قدیم مصری تہذیب میں اہرام مصر بنانے اور مردہ جسم کو حنوط کرنے کی ٹیکنالوجی تو تھی لیکن جدید سائنس نہ تھی۔ اہرام بنانا اور لاشوں کو حنوط کرنا قدیم مصر کی روایات کا حصہ تھا لہٰذا ان مشاغل کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئیں۔ اسی طرح موئن جودڑو اور ہڑپہ شہری ثقافتیں تھیں، لہٰذا ان تہذیبوں کی Civil Technology خاص ترقی یافتہ تھیں مثلاً ان جگہوں پر نکاسی آب کا بہترین نظام تھا لیکن یہاں بھی جدید سائنس جیسی کسی علمیت کا پتہ نہیں ملتا۔

قدیم یونان میں لفظ ٹیکنی سے مراد ایک فن پارہ (یعنی آرٹ کا نمونہ) تھا۔ چونکہ حسن پرستی قدیم یونان کی بنیادی قدر تھی لہٰذا یونان کی تہذیب Technology Artifart میں خوبصورتی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر قدیم یونان میں ستون اصل میں اس لیے ترچھے بنائے جاتے تھے کہ وہ دیکھنے والے کو سیدھے معلوم ہوں۔ اس معاشرے میں ٹیکنالوجی کا تعلق آرٹ سے تھا نہ کہ کسی سائنس نما علمیت سے۔

قدیم تہذیبوں کے بعد قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں رومیوں نے بھی بھرپور تدبیریں کیں۔ یہ قوم اپنی عسکری فتوحات اور جنگی چالوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ انہوں نے یونان کو فتح کرنے کے بعد یورپ کے ایک بڑے حصے پر تقریباً ہزار سال تک حکومت کی۔ رومیوں کی قابل ذکر ٹیکنالوجی یعنی تدابیر میں فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے پکی سڑکوں کی تعمیر، حکومت کے کونوں کونوں تک ترسیل اطلاع کا انتظام، بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے پکے گھروں کی تعمیر، شہروں میں پانی کا انتظام اور گرم حمام وغیرہ ہیں۔ رومیوں کی اکثر تدابیر آسان اور عوامی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔

اوپر کی مثالوں سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ اوّل تو یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں جیسے کہ ہمیں آج کل کی دنیا میں نظر آتا ہے بلکہ تاریخ میں جدید سائنس کے بغیر بھی ٹیکنالوجی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے۔ دوسری خاص بات یہ کہ

ٹیکنالوجی یا تدبیر قدر سے آزاد نہیں ہوتی بلکہ اس معاشرے کی بنیاد اور ایمانیات اس ٹیکنالوجی یا تدبیر میں پنہاں ہوتی ہیں۔

موجودہ دور کی ٹیکنالوجی: ٹیکنو سائنس (Technoscience)

ایک عام صارف کے لیے موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں فرق کرنا ممکن نہیں۔ جدید پیداواری اشیاء (مصنوعات ہوں یا خدمات) سائنس اور ٹیکنالوجی کا مرکب نظر آتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پنپنے والے اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے مخصوص مرکب کو اکثر مغربی مفکرین (مثلاً برونو لاٹور) ٹیکنو سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ٹیکنو سائنس محض ایک تدبیر نہیں بلکہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے، جدید سائنسی طرز فکر پر مبنی اور سرمایہ دارانہ اداروں کی تحقیقی مد میں مالی معاونت سے بنائی جانے والی تدبیر کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ٹیکنالوجی انسان کی ضروریات سے زیادہ انسان کی خواہشات کی تکمیل میں مصروف نظر آتی ہے مثلاً ایک سادہ اور مضبوط موٹر کار شہری زندگی میں سواری کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن روز بروز بدلتے ہوئے دلکش ماڈل اور ڈیزائن کے کیا معنی؟ اسی طرح ٹیلی فون بڑھتے ہوئے فاصلوں اور رابطوں کو کم کرنے کی ضرورت تو ہے لیکن ان کے بڑھتے چڑھتے ماڈل اور خصوصیات محض منافع بڑھانے کی ترکیبیں ہیں۔

موجودہ دور کی ٹیکنالوجی (یعنی ٹیکنو سائنس) کا دارومدار سرمایہ دارانہ نظم اور جدید سائنس پر ہے اور یہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے ایک مؤثر آلہ کار ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں بنائی جانے والی بیشتر ٹیکنالوجی ملکوں کی جنگی اور دفاعی ضرورتوں کا نتیجہ تھی۔ امریکا، روس اور یورپی ممالک نے جنگ عظیم اوّل اور دوم کے دور میں بے تحاشہ ایجادیں کیں اور انہیں مؤثر طور پر استعمال بھی کیا۔ بعد میں سرد جنگوں کے دوران مختلف ترقی یافتہ ملکوں کے دفاعی اداروں اور سرمایہ کار کارپوریشن نے اس عمل کو جاری رکھا۔ ان میں چند قابل ذکر نام امریکی خلائی تحقیق کا ادارہ NASA اور امریکا ہی کا محکمہ دفاع ہے۔ موجودہ دور میں ٹیکنو سائنس تحقیق کثیر سرمائے کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ سرمایہ یا تو کوئی حکومتی ادارہ اپنی دفاعی یا جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فراہم کر سکتا ہے یا پھر کوئی ایسی بین الاقوامی سرمایہ کار کمپنی جسے اپنے منافع کی بڑھوتری کے لیے

کسی ٹیکنیکی جدت کی ضرورت ہو۔ اس کثیر سرمائے سے جدید ٹیکنیکی آلات سے لیس سائنسی تجربہ گاہیں اوراعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے جاتے ہیں اور پھر یہاں دنیا کے بہترین دماغ جمع کیے جاتے ہیں جو ایسی تحقیق کرسکیں جس کے نتیجے میں سرمائے کو مزید فروغ حاصل ہو یا سرمائے کو فروغ دینے والی ریاست کا دفاع ہو سکے۔ مختصر یہ کہ سرمایہ دارانہ نظم میں سرمائے کی بڑھوتری کے مخصوص مقصد کی خاطر جدید سائنس کے تسخیر کائنات والے اصول کے تحت تدبیر کا نام ٹیکنو سائنس ہے۔

نظریہ اور عمل

جدید دور کے معاشرے میں نظریہ اور عمل کی بحث بہت اہم ہے۔ روایتی طور پر اس بحث میں دو انتہائی متضاد نکتہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف مفکرین کا خیال ہے کہ نظریہ، عقائد یا خیالات کی بنیاد پر معاشرے میں عمل اور عملی طریقے رائج ہوتے ہیں جبکہ تاریخی مادیت کے حامیوں کے مطابق معاشرے کے عمل اور رائج عملی طریقوں سے لوگوں کے نظریات اور عقائد نشوونما پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں علم کا منبع مادی دنیا قرار پاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک اسلامی معاشرے میں مسلمان دین کا علم حاصل کرتے ہیں اور علماء کی مدد سے اسے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رائج کرتے ہیں لیکن موجودہ مسلمان معاشروں میں ایسی صورت نظر نہیں آتی۔ آج کا مسلمان زیادہ تر دنیا کمانے کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اور دین کی معلومات ناظرہ قرآن مجید اور نماز کی دعاؤں تک محدود ہے۔ اس قدر کمزور علمی بنیادوں کے ساتھ جب ایک عام مسلمان کا ٹیکنو سائنس سے سامنا ہوتا ہے تو وہ اس کی بنیادی قدر بڑھوتری برائے بڑھوتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عبادت کم اور تصرف فی الارض زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی شناخت عبد کی بجائے ایک اچھے صارف کی ہو جاتی ہے لہٰذا موجودہ دور میں سرمایہ داری اور ٹیکنو سائنس کے طاغوت سے دفاع کے لیے دین کا علم اور معرفت الٰہی لازمی ہیں۔

مطالعۂ کتاب **ڈاکٹر محمد امین**

مدیر البرہان کی کتاب ’’پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟‘‘
پر ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کے تبصرے کا جائزہ (۲)

اصلاح اور اقامتِ دین متغایر تصورات نہیں

* قرآن حکیم میں انبیاء کے مقاصد بعثت اور طریق کار کے حوالے سے دعوت، تعلیم وتزکیہ، اصلاح، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اقامت دین، اظہارِ دین اور غلبۂ دین کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جو قریب المفہوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرد کو مکلف بنایا ہے اور وہی آخرت میں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا۔ لہٰذا انبیاء فرد کو مخاطب کرتے ہیں کہ وہ اپنی ساری زندگی، افرادی زندگی بھی اور اجتماعی زندگی بھی، اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزارے۔ اجتماعی زندگی میں معاشرہ اور ریاست دونوں شامل ہیں جو افراد ہی سے مل کر بنتے ہیں اور انہیں افراد ہی چلاتے ہیں لہٰذا جب فرد کی اصلاح ہوجائے گی تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی دینی تعلیمات پر عمل کرے گا اور معاشرے اور ریاست کو بھی دینی تعلیمات کے مطابق چلائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کی اصلاح کے لیے انفرادی کوششیں بھی کی جاسکتی ہیں اور تنظیم اور ادارہ بنا کر بھی۔ لہٰذا ’اصلاح‘ میں فرد کی اصلاح اور معاشرے وریاست کی اصلاح دونوں شامل ہیں۔

* یہی حال اقامت دین کا ہے کہ اس سے مراد ہے پورے دین کی اقامت اور پورے دین کی اقامت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ فرد اپنی ذاتی زندگی میں بھی دینی تعلیمات پر عمل نہ کرے اور اسی طرح معاشرے اور ریاست کو بھی دینی تعلیمات کے مطابق نہ چلائے۔

* لہٰذا ’اصلاح‘ اور ’اقامت دین‘ متغایر تصورات نہیں ہیں بلکہ دونوں سے مقصود ایک ہی ہے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہماری کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ابتداء ہی میں جو بحث اٹھائی ہے، اس میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر ’اصلاح‘ ہے ’انقلاب‘ نہیں۔

اب ڈاکٹر صاحب قبلہ پتہ نہیں یہ انقلاب کا لفظ کہاں سے لائے ہیں؟ یہ عربی لفظ ضرور ہے لیکن نہ تو قرآن حکیم میں (اسلامی سیاسی انقلاب کے معنوں میں) استعمال ہوا ہے، نہ سنت میں اور نہ ہماری چودہ سو سال کی دینی علمی روایت میں۔ ماضیٔ قریب کی مغربی روایت میں Revolution کے لفظ کا ترجمہ لوگوں نے ’انقلاب‘ کرنا شروع کردیا ہے۔ اس سے یا تو مراد بڑی سیاسی تبدیلی لی جاتی ہے جو قوت سے لائی جائے جیسے فلاں ملک میں ’’فوجی انقلاب‘‘ آگیا

ہے۔ بلکہ اب تو Soft Revolution یعنی نرم انقلاب کی اصطلاح بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ یا انقلاب کا لفظ کسی بڑی منہجی تبدیلی کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے انقلابِ فرانس (French Revolution) یا صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) وغیرہ۔

اسلامی سیاسی تناظر میں بڑی تبدیلی کے معنوں میں ہمارے ہاں جماعت اسلامی کچھ عرصہ تک ’اسلامی انقلاب‘ کا نعرہ لگاتی رہی ہے (لیکن اب اس نے اسے ’’اسلامی پاکستان اور خوش حال پاکستان‘‘ سے بدل دیا ہے اور آپ منصورہ فون کر کے یہ نغمہ سن سکتے ہیں) یا پھر تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم عمر بھر ’اسلامی انقلاب‘ کا نعرہ لگاتے رہے ہیں۔ ماضی میں جماعت اسلامی اس مفہوم میں اقامت دین اور حکومت الٰہیہ کے الفاظ بھی استعمال کرتی رہی ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ریاست وسیاست کے الفاظ بھی (یعنی جن معنوں میں یہ آج ہمارے ہاں مستعمل ہیں) قرآن وسنت میں اور ہماری چودہ سو سالہ دینی علمی روایت میں استعمال نہیں ہوئے۔ ان کی بجائے حکم (حاکم)، خلیفہ، مُلک (اقتدار) یا مَلک (بادشاہ) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ریاست (بمعنی State) اور سیاست بمعنی (Political Science) نوزائیدہ مغربی اصطلاحات ہیں۔ یہی حال ’اسلامی جمہوریت‘ کا ہے کہ جمہور کا لفظ اگرچہ عربی ہے اور ہماری دینی علمی روایت میں مستعمل بھی ہے لیکن اسلامی جمہوریت کا لفظ، اسلام کے سیاسی منہاج کے معنوں میں، نہ تو قرآن وسنت میں استعمال ہوا ہے اور نہ ہماری چودہ سو سالہ دینی علمی روایت میں۔

خلاصہ یہ کہ ’انقلاب‘، ’اسلامی انقلاب‘، ’اسلامی ریاست‘، ’اسلامی جمہوریت‘، ’نظامِ مصطفیٰ‘ جیسی اصطلاحات جو آج کل ہم بلا تکلف استعمال کرتے ہیں، قرآن وسنت میں استعمال نہیں ہوئیں اور نہ ان کا مفہوم قرآن وسنت کا طے کردہ ہے بلکہ یہ اصطلاحات معاصر اہل علم کی وضع کردہ ہیں اور انہوں نے ہی ان کے مفاہیم کا تعین کیا ہے جو قرآن وسنت کی رو سے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ راقم کے نزدیک ان کے مفاہیم اکثر مبہم، ناقص اور Confusing ہیں اور خلطِ مبحث، غلط فہمیوں (Misconceptions) اور غلط دینی تصورات کو جنم دیتے ہیں۔

اب ہم پہلے یہ واضح کر دیں کہ ہمارے نزدیک دین میں ’اصلاح‘ سے کیا مراد ہے، پھر ہم ڈاکٹر انصاری صاحب کے تصور ’انقلاب‘ کی طرف لوٹیں گے۔

۱۔ دیکھیے! دین اسلام کیا ہے؟ ہم قرآن وسنت سے اور اس کی تشریح اور اس پر عمل کے حوالے سے سلف اور جمہور علماء سے جو سمجھے ہیں وہ یہ ہے کہ دین اسلام نام ہے اس چیز کا کہ دنیا کی زندگی اللہ ورسول کی تعلیمات کے مطابق بسر کی جائے تا کہ آخرت میں اللہ سبحانہ ہم سے راضی ہو

جائیں اور ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازیں۔ دنیا کی زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی یعنی ہمیں زندگی کے سارے شعبوں میں دین کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

اور یہ کہ دین کا پہلا اور بنیادی مخاطب فرد ہے، وہی مکلف ہے اور وہی آخرت میں اللہ کو جواب دہ ہوگا۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی اللہ کا بندہ اور مکلف ہے اور معاشرے اور ریاست میں بھی جو اس کا کردار ہو، وہ اس میں بھی مکلف ہے اور وہاں بھی اللہ کی بندگی اور اطاعت اس پر واجب ہے۔

مزید وضاحت کے لیے اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ دین کے عموماً چار شعبے سمجھے جاتے ہیں: ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات۔ ایمانیات میں توحید، رسالت، آخرت وغیرہ جیسے عقائد شامل ہیں۔ عبادات کے اہم ارکان نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ہیں۔ اخلاقیات میں ہر طرح کے رذائل وفضائل اور اچھے اور بُرے آداب شامل ہیں جبکہ معاملات میں دنیوی زندگی کے اہم شعبے جیسے معاشرت، معیشت، سیاست، عدالت وغیرہ شامل ہیں۔ دین میں پورے کے پورے داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ان سارے شعبوں میں دینی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں جو ہمارے رہبر و رہنما اور پیشوا ہیں۔ ان کا اسوہ ہمارے لیے ماڈل اور نمونہ ہے جس کی پیروی کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے افراد پر محنت کی، انہیں مسلمان بنایا، انہیں ساتھ ملا کر اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست[۱] قائم کی۔ تب سے مسلمان بھی موجود ہیں، ان کا معاشرہ بھی قائم چلا آ رہا ہے اور ریاست بھی۔ تاہم مرورِ وقت سے مسلمانوں میں، ان کے معاشرے میں اور ان کی ریاست میں بتقاضائے بشریت خامیاں، کمیاں اور کوتاہیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ علماء و صلحاء اور اللہ کے نیک بندے ہر عہد میں کوششیں کرتے رہے ہیں کہ ان کی یہ خامیاں، کوتاہیاں دور ہو جائیں اور وہ زیادہ سے زیادہ اس معیار کے مطابق ہو جائیں جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی عمل کو ہم اصلاح کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی انہی ہمہ جہت معنوں میں 'اصلاح' کا لفظ استعمال ہوا ہے[۲]۔ اور اس کے لیے دعوت، تعلیم کتاب و حکمت و تزکیہ، انذار اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ہم بھی اللہ کے ان نیک بندوں کی اقتداء میں یہ کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی قرآن و سنت کے مطابق اصلاح ہو جائے... ان کے فکر کی بھی

---

[۱] 'اسلامی ریاست' کا لفظ ہم یہاں بطور غلط العام استعمال کر رہے ہیں۔

[۲] الاعراف ۷:۵۶، ۸۵، ھود ۱۱:۸۸

اور ان کے عمل کی بھی، ان کی انفرادی زندگی کی بھی اور ان کی اجتماعی زندگی کی بھی (یعنی ان کے معاشرے اور ریاست کی بھی)۔

۲۔ اب اس معاملے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ کام کیسے کیا؟ اس کی ابتدائی اور بنیادی صورت وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چار دفعہ قرآن حکیم میں بیان کیا ہے ① اور جس کا خلاصہ ہے 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ'۔ یعنی آپ نے لوگوں کو دین کی دعوت دی، ان کو قبول حق کی ترغیب دی اور جو لوگ دین اسلام کو قبول کرتے گئے آپ ان کے نفوس کا تزکیہ وتربیت کرتے رہے تا کہ وہ دین پر بآسانی عمل کر سکیں۔ پھر آپ ان کو منظم کرتے رہے، معاشرہ تشکیل پاتا رہا، ریاست وجود میں آتی گئی، کفار کی طرف سے مزاحمت کا جواب دیا جاتا رہا، یہاں تک کہ لوگ فوج در فوج دین میں داخل ہوتے گئے اور اللہ کا دین غالب آ گیا۔

۳۔ یہاں کچھ باتوں کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو پیغمبر سابقہ قوموں میں بھیجے تھے ان سب نے دعوت وتعلیم وتزکیہ کا کام کیا ② لیکن ان میں سے اکثر منظم مسلم معاشرہ اور ریاست وحکومت قائم نہیں کر سکے لیکن ظاہر ہے کہ وہ کامیاب رہے کیونکہ انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔ لوگوں تک دین کی دعوت پہنچائی اور انہیں اس پر عمل کر کے دکھایا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو آخری رسول قرار دیا اور ان کو یہ توفیق دی کہ وہ مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست قائم کر سکیں اور چونکہ مسلمان، مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست اِس وقت پہلے سے موجود ہیں لہٰذا ہمیں اب کام صفر سے شروع نہیں کرنا اور مسلم معاشرے اور ریاست کو عدم سے وجود میں نہیں لانا؛ بلکہ مسلمان بھی موجود ہیں، مسلم معاشرہ بھی موجود ہے اور مسلم ریاست بھی موجود ہے، ہمیں صرف ان کی اصلاح کرنی ہے، قرآن وسنت کے معیار کے مطابق ان کی تجدید کرنی ہے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ قرآن وسنت کے مطابق ہو جائیں۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ اصلاح عقائد میں بھی درکار ہے، عبادات میں بھی، اخلاق میں بھی اور معاملات (یعنی معاشرت، سیاست، معیشت.... میں بھی)۔ اس کام کو قرآن حکیم نے تعلیم، دعوت، تبلیغ، تزکیہ، اصلاح، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اقامتِ دین، اظہارِ دین اور غلبۂ دین وغیرہ کا نام دیا ہے۔

---

① البقرہ ۲:۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳:۱۶۴، الجمعہ ۶۲:۲

② طٰہٰ ۲۰:۴۴، نوح ۷۱:۵-۱۰، النازعات ۷۹:۱۷، ۱۸، الاعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۹

زندگی کے سارے شعبوں میں دین پر عمل چونکہ مطلوب ہے اور ہر شعبے میں کام قرآن وسنت کے معیار کے مطابق نہیں ہو رہا اس لیے ان میں اصلاح کا کام یا ان میں سے کسی ایک شعبے میں اصلاح کا کام ہر مسلمان اب اپنی صلاحیت کے مطابق انفرادی سطح پر بھی کر سکتا ہے اور اس کے لیے ضرورت ہو تو جماعت اور تنظیم بھی بنائی جا سکتی ہے بشرطیکہ ان سے الجماعۃ یعنی منظم مسلم معاشرے و ریاست کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ مسلمان ایک امت ہیں، وہ سب بھائی بھائی ہیں اور ان میں اتحاد و یکجہتی مقصودِ شرعی ہے لہٰذا ان میں فرقہ بندی اور انتشار جو ان کی ہوا خیزی کا سبب بنے ممنوع ہے تاہم تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ کے تحت مل جل کر دینی اصلاحی کام کیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ اس وقت تک ہم نے جو وضاحت کی اس سے ظاہر ہے کہ دین کے چار بڑے شعبے ہیں۔ چوتھے شعبے معاملات کے آگے مزید کئی شعبے ہیں جن میں سے سیاست بھی ایک شعبہ ہے لہٰذا دین میں اس کی شرعی حیثیت یہی ہے کہ وہ دین کے چوتھے شعبے کا بھی چوتھا شعبہ ہے، وہ پورا دین نہیں ہے، نہ دین کا بنیادی نصب العین ہے۔

۵۔ اب اگر ہم سیاسی شعبے کی اصلاح کی بات کریں تو خلافت راشدہ کے بعد سیاسی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان کی اصلاح کی کوشش میں امت کے دو نامور صحابی اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قریبی عزیز (حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ) مظلومانہ شہید ہو گئے اور اصلاح بھی نہ ہو سکی۔ ①

اس پر سلف نے یہ طریقہ اپنایا کہ غیر صالح مسلم حکمرانوں کی مسلح درستگی کی کوشش نہ کی جائے

---

① ڈاکٹر انصاری صاحب کو ہمارے یہ الفاظ پسند نہیں آئے کہ حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی جدوجہد ناکام ہو گئی۔ جہاں تک ان بزرگوں کا تعلق ہے وہ یقیناً اللہ کے ہاں کامیاب ہیں کہ انہوں نے عزیمت سے خرابی کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور اس راہ میں جان بھی قربان کر دی لیکن اگر جذباتیت سے ہٹ کر عملی نتائج کے حوالے سے سوچا جائے تو اس تلخ حقیقت کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے کہ دونوں بزرگ نہ تو بنو امیہ کی حکومت ختم کر سکے اور نہ ان کا نظام حکومت۔ ان کے بعد علماء و صلحائے امت نے کبھی سیاسی جماعت بنا کر اور جتھے بندی کر کے غیر صالح مسلم حکمرانوں کا تختہ الٹنے کا طریقہ نہیں اپنایا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے عصر حاضر کی جو مثالیں دی ہیں وہ بھی بے محل ہیں کیونکہ وہ غیر مسلم استعماری حکومتوں کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی مثالیں ہیں نہ کہ غیر صالح مسلم حکمرانوں کی حکومت کے خاتمے کی۔ عصر حاضر میں ان کی جماعت (جماعت اسلامی)، دیگر جدید دینی تحریکیں جیسے الاخوان المسلمون اور سیاسی جدوجہد میں مشغول دیگر علماء بلکہ جمہور علماء غیر صالح مسلم حکومتوں کے خلاف پر امن جدوجہد کے حامی ہیں نہ کہ مسلح مزاحمت سے ان کے خاتمے کے۔

تا کہ امت کا نقصان نہ ہو چنانچہ اس کے بعد تقریباً بارہ سو سال تک امت کے علماء وصلحاء نے جماعت بنا کر اور جتھہ بندی کر کے غیر صالح مسلم حکمرانوں کی حکومت کو بزورِ بازو بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ پر امن اصلاحی کوششیں جاری رکھیں تا آنکہ متعدد عوامل کی بناء پر امت زوال پذیر ہوگئی۔ اور اس وقت ہم بحیثیت امت اس زوال سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۶۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے زوال پذیر ہونے کی بنیادی داخلی وجہ یہ ہے کہ ہم دین کے سارے شعبوں (عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات) میں قرآن وسنت کی سچی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہے اور بنیادی خارجی وجہ یہ ہے کہ ایک الحادی، خلافِ اسلام اور مسلم دشمن تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے، ہم اس کے شکنجے سے نکل کر اور اسے ردّ کر کے اسلامی نظریات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے راہ عمل وضع نہیں کر پا رہے۔ لہٰذا آج ہماری ضرورت یہ ہے کہ ہم زندگی کے سارے شعبوں میں اپنی اصلاح کریں اور مذکورہ داخلی وخارجی چیلنجوں کا مقابلہ کریں۔ ہماری دینی قوتوں نے اس داخلی اور خارجی چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو مناہج عمل وضع کیے ہیں، وہ ہماری رائے میں ناقص اور غیر مناسب ہیں اور غیر مؤثر ثابت ہوئے ہیں لہٰذا ان کی اصلاح ضروری ہے۔

۷۔ اگر ڈاکٹر انصاری صاحب کے نزدیک 'انقلاب' سے مراد 'اقامتِ دین' ہے جیسا کہ ان کی جماعت کے دستور میں ہے تو اقامت دین کا مطلب تو سارے دین کی اقامت ہے اور دین کی اقامت کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ ہم دین پر عمل کریں لہٰذا زندگی کے سارے شعبوں میں دین پر عمل اقامت دین، ہی کی ایک صورت اور اس کا مطالبہ ہے۔ اور زندگی کے سارے شعبوں میں دین پر عمل میں جو خرابیاں اور کوتاہیاں پیدا ہوگئی ہیں، ہم ان کی اصلاح کرنے کی جو دعوت دے رہے ہیں تو یہی تو اقامت دین ہے اور اس میں سیاسی شعبے کی اصلاح اور ریاست کے کردار کا اسلامی ہونا بھی شامل ہے۔

اگر کوئی فرد یا تنظیم غیر صالح مسلم حکمرانوں کی اصلاح کی پُرامن کوشش کر رہی ہو تا کہ مسلم ریاست اسلامی اصولوں پر کماحقہ عمل کرے تو یہ بھی اقامت دین ہی کا ایک جزو ہے۔ تاہم یہ پورے دین کی اقامت نہیں ہے۔ یہ بات قابل غور اور قابل بحث ہو سکتی ہے کہ غیر صالح مسلمانوں کو اقتدار سے ہٹانے یا مسلم ریاست کو اسلام مخالف ومسلم دشمن مغربی فکر وتہذیب کے شکنجے سے نکالنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے، اس میں اختلاف فکر ونظر ہو سکتا ہے اور اس پر دلائل کے ساتھ بحث مباحثہ جاری رکھا جا سکتا ہے تا کہ اس کے لیے کوئی مؤثر لائحہ عمل اختیار کیا جا سکے۔

اگر سارے دین کی اقامت پیش نظر ہو تو پھر زندگی کے سارے شعبوں میں یعنی عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا اور صرف سیاسی شعبے کی اصلاح کی کسی کوشش کو سارے دین کی اقامت کی جدوجہد نہیں کہا جاسکتا۔ ① سارے دین کی اقامت کا طریقہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیمؑ وموسیٰؑ کو بتایا ہے ② اور جو قرآن حکیم میں نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بار بار بتایا ہے اور اسی پر عمل کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سارے دین کی اقامت کی یعنی تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس۔

خلاصہ یہ کہ اقامت دین سے مراد سارے دین کی اقامت اور زندگی کے سارے شعبوں میں دین پر عمل ہے جس کا طریقہ قرآن حکیم اور اسوۂ نبوی کے مطابق تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس ہے۔ اسے قرآن حکیم نے دعوت، تبلیغ، اصلاح، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی کہا ہے۔ اور زندگی کے سارے شعبوں میں (بشمول سیاست وریاست) دین پر عمل میں جو کمیاں کوتاہیاں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کو ہم جو ’اصلاح‘ کہہ رہے ہیں تو اس کا طریقہ اور ذریعہ بھی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفس ہے۔ یہی کارِ دعوت، تبلیغ، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور یہی طریقِ اقامت دین اور (اظہارِ دین وغلبۂ دین) ہے۔ یوں ’اصلاح‘ اور ’اقامت دین‘ ایک ہی چیز ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بنیادی فکری بحث تھی جس پر قلم اٹھانا ضروری تھا۔ دوسری فروعی باتیں بھی ہیں جن پر ہم ان شاء اللہ اگلی نشست میں ڈاکٹر صاحب سے مکالمہ جاری رکھیں گے۔

استدراک

البرہان پریس جا رہا تھا کہ ہمیں ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے تلامذہ کا لٹریچر ملا جس میں ڈاکٹر صاحب کا مؤقف زیادہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے لیکن ہم نے مضمون نہیں روکا کیونکہ خواہ وہ انقلاب سے مراد خروج وجہاد لیں یا جماعت اسلامی برانڈ اسلامی انقلاب، ہمارا مؤقف پھر بھی وہی ہے کہ جب تک ہم دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت، اصلاح وتزکیۂ نفس کا حق ادا نہ کریں اور فرد و معاشرے کو نہ بدلیں اُس وقت تک ریاستی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

---

① یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اکثر اہل علم پاکستان بننے کے بعد یہ کہہ کر جماعت چھوڑ گئے تھے کہ جماعت صرف سیاسی شعبے میں اقامت دین کی کوشش کر رہی ہے نہ کہ اپنے اصل دعوے کے مطابق سارے دین کی۔

② الاعلیٰ ۸۷:۱۹

تبصرۂ کتب

ملک شفقت حیات اعوان

'قلم قتلے'

از ڈاکٹر انوار احمد بگوی

''قلم قتلے'' ڈاکٹر انوار احمد بگوی صاحب کے متفرق مضامین پر مشتمل کتاب ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بگوی صاحب پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہیں۔ محکمہ صحت، حکومت پنجاب میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور بطور ایڈیشنل سیکرٹری ہیلتھ ریٹائر ہوئے اور موجودہ حیثیت میں چیف ایگزیکٹو منصورہ ٹیچنگ ہسپتال لاہور میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کا تعلق بھیرہ کے مشہور علمی و دینی خاندان بگویہ سے ہے جن کی علمی و مذہبی خدمات پر ڈاکٹر صاحب کی پانچ ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہر جلد سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہے۔ تذکارِ بگویہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی اب تک مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے:

۱۔ ہسٹری آف سرگودھا (ایک تنقیدی مطالعہ)

۲۔ ۹۰ سالہ اشاریہ ماہنامہ شمس الاسلام، بھیرہ

۳۔ خمینی و فردوسی کی سرزمین (سفرنامہ ایران)

۴۔ قلم کا سفر (منتخب تحریروں کا مجموعہ)

آپ کی موجودہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اردو حصہ ۵۲۴ صفحات اور انگریزی حصہ ۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کتاب مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:

۱۔ اپنے وطن میں ۲۔ مذہبیات ۳۔ تہذیب و معاشرت

۴۔ دین و دانش ۵۔ سفرنامہ ازبکستان ۶۔ زیر تالیف

۷۔ میری رائے کے مطابق ۸۔ کتابیں میری نظر میں

۹۔ صحت عامہ ۱۰۔ پہاڑی کے چراغ

۱۱۔ ادارتی نوٹ ۱۲۔ تاثرات ۱۳۔ انگریزی مراسلے

تمام مضامین جو سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی جہتوں پر مشتمل ہیں دلچسپی کے حامل ہیں۔ کئی مضامین کتابوں پر مصنف کی رائے اور تاثر پر مبنی ہیں۔ ایک مضمون سفرنامہ ازبکستان ''امیر تیمور، امام بخاری اور خواجہ نقشبند کے دیس میں'' کے نام سے کتاب کا حصہ ہے اور بڑے دلچسپ تاثرات کا حامل ہے۔ مصنف نے تاشقند، سمرقند اور بخارا، جو کہ ازبکستان کے اہم شہر ہیں، کے بارے میں اپنے تفصیلی مشاہدات کا بڑے خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے جو کہ ۵۰ صفحات پر محیط ہے۔

'پہاڑی کے چراغ' کے عنوان کے تحت مصنف کے وہ مضامین شامل ہیں جس میں انہوں نے اپنی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ ان میں مولانا امین احسن اصلاحی، محبوب سبحانی، محمد عالم مختار حق، مولانا حسن المرتضیٰ خاور اور مولانا صلاح الدین احمد شامل ہیں۔ سب سے زیادہ طویل حصہ کتابوں پر مصنف کے تاثرات پر مشتمل مضامین کو حاصل ہے جو تقریباً ۹۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یوں تو کتاب میں جابجا مولانا امین احسن اصلاحی سے متعلق مضامین ملتے ہیں لیکن ایک مضمون خاص طور پر مصنف نے مولانا پر اپنی اس تالیف کے لیے لکھا ہے۔

تاثرات میں ان مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے جو مصنف کی دو کتابوں ''قلم کا سفر'' اور ''خمینی اور فردوسی کی سرزمین'' پر مختلف اہل قلم نے لکھے ہیں۔ دین و دانش کی ذیل میں مصنف نے مختلف جرائد کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جس میں ماہنامہ ''روح بلند، سوئے حرم، المنبر اور شمس الاسلام'' کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک دوسرے عنوان کے تحت آپ نے ماہنامہ ''البرہان'' اور رسالہ ''حکمت قرآن'' کے مضامین کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ''تصوف اور تاریخ کی حقیقت'' کے عنوان کے تحت مصنف نے اپنے ایک مکتوب کو بھی کتاب کا حصہ بنایا ہے جو تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس خاکسار کے ایک مکتوب میں کیے گئے استفسارات اور بھیجے گئے مضامین اور مواد پر مشتمل ہے۔

الغرض پوری کتاب ڈاکٹر انوار احمد بگوی صاحب کے نہایت علمی اور فکری مضامین کا ایک دلکش مرقع ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

CPL No. 296 March 2021

اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ

ڈاکٹر محمد امین کی نئی کتاب

اصلاحِ دینی مدارس

مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک موجودہ دینی مدارس اور درسِ نظامی میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ بارہ سو سال تک اسلاف کا جو نظامِ تعلیم تھا وہ بھی موجودہ درسِ نظامی سے مختلف تھا لہٰذا آج کے علماء کرام کو موجودہ مدارس اور درسِ نظامی کے نظام پر نظر ثانی ضرور کرنی چاہیے

صفحات: ۳۵۲ قیمت: ۴۰۰ روپے

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com